انتساب

حفیظ جاوید کے نام

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

دیواروں پر لکھنا

کل ایک دیوار پر یہ حکم لکھا نظر آیا ''اس دیوار پر لکھنا منع ہے'' میں نے سوچا، جب دیوار کے مالک کو اپنی دیوار پر کسی قسم کی تحریر پسند نہ تھی تو یہ حکم ہی کیوں لکھوایا۔ غالباً اسی نفسیاتی غلطی کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ساری دیوار بے شمار چھوٹے اور موٹے بد خط اور خوش خط حروف سے بھری ہوئی تھی۔ لیکن شہر کی قریب قریب ہر دیوار بغیر کسی نفسیاتی تحریک لکھنے لکھانے کا نشانہ بن رہی ہے جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دیواروں پر لکھنا انسان کی فطرت میں داخل ہے جس طرح ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، اسی طرح دیواروں پر لکھتے بھی ہیں۔

میری بچی ہے ڈیڑھ برس کی۔ اس نے مجھے کاغذوں پر لکھتے دیکھا ہے لیکن جب اس کے ہاتھ میں پہلی بار پنسل آئی تو اس نے کاغذ کے بجائے میرے کمرے کی دیواریں ہی کالی کیں۔ وہ اس شغل میں مصروف تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ دیواروں پر سیاہ لکیریں کھینچ کر ایک عجیب قسم کی تسکین محسوس کر رہی ہے۔ شروع شروع میں انسان اس تسکین و تفریح ہی کے لیے لکھتا ہے لیکن بعد میں اپنا پیٹ پالنے کے لیے لکھتا ہے۔ ابتداء میں تو اس کی تحریر صرف دیواریں کالی کرتی ہیں لیکن آگے چل کر اس کی تحریریں دیواریں بناتی بھی ہے اور ڈھاتی بھی ہے۔ کوئی چغتائی بن جاتا ہے اور کوئی اقبال ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور بعض دیواروں پر لکھ لکھ ایسی مصوری اور شاعری کرتے ہیں کہ جسے انسان دیکھ کر نقش بہ دیوار ہو جاتا ہے۔

کتابی ادب ہے، اخباری ادب ہے، رسائلی ادب ہے اسی طرح دیواری

ادب بھی ہے۔ کاغذ پہ صرف یہ نتیجہ نکال کے رکھا جا سکتا ہے لیکن دیوار پر آپ کلیجہ، گردے، دل پھیپھڑے سبھی نکال کر رکھ سکتے ہیں۔ سکولوں، کالجوں اور منڈووں کے باتھ روموں میں جائیے۔ ان کی دیواروں پر آپ کو جملہ اعضائے نسوانی کی تصویریں نظر آ جائیں گی۔

دیواروں پر تو خیر انسان لکھتا ہی ہے لیکن بیت الخلاء کی دیواروں پر ضرور لکھتا ہے۔ مسجد میں چلے جائیے اس کے غسل خانے کی دیواروں پر بھی آپ کو ترقی پسند ادب اور ترقی پسند مصوری بکھری نظر آئے گی۔ یہی نہیں آپ ان دیواری تحریروں سے ضروری معلومات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ مسجد کے موذن صاحب کس طبیعت کے مالک ہیں۔ امام صاحب کو کون سے کھانے مرغوب ہیں۔ سکول کا کون کون سا استاد میر تقی میر کا تتبع کرتا ہے۔ کالج میں پرنسپل صاحب مقبول ہیں یا نہیں۔ اسی طرح کی اور سینکڑوں باتیں آپ کو ایک ہی نشست میں ان دیواروں کے مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

ایک کہانی کے سلسلے میں بمبئی کی ایک فلم کمپنی سے میرا معاہدہ ہو رہا تھا۔ ایگریمنٹ پر صرف دستخط کرنے باقی تھے کہ مجھے باتھ روم جانا پڑا۔ سامنے دیوار پر زرد چاک سے یہ لکھا ہوا نظر آیا اور تو سب ٹھیک ہے لیکن پگار کیوں نہیں دیتے؟ پگار کا مطلب ہے تنخواہ میں نے ایگریمنٹ پر دستخط نہ کئے۔ اس فلم کمپنی میں اور سب ٹھیک تھا۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ بالکل درست تھی لیکن کام کرنے والوں کو چھ مہینے سے تنخواہ نہیں دی گئی تھی۔

دیوار پر لکھنا ایسا ہی ہے جیسے سر بازار آواز بلند کر کے کوئی اعلان کر دیا جائے

لیکن بیت الخلاء کی دیواروں پر وہ علوم لکھے جاتے ہیں جن کے مطالعے کے لیے سکون تنہائی اور اطمینان قلب درکار ہوتا ہے۔ مختصر نشست ہی میں آپ ان چھوٹی چھوٹی لائبریریوں سے روزمرہ کی زندگی کے سینکڑوں اسرار معلوم کر سکتے ہیں۔ بھاری بھرکم کتابوں کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں۔ ذرا گردن اٹھائی اور ہیولک ایلس کی چاروں جلدوں کا نچوڑ دیکھ لیا۔

غالب کا ایک شعر ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

چونکہ ایسی دیواروں پر لکھتے وقت دم تحریر فرشتے نہیں ہو سکتے اس لیے پکڑنے پکڑانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دیواری ادب اور مصوری کی یہ شاخ حکومت کے احتساب اور اس کے خوف سے بالکل پاک رہی ہے۔ انسان ان دیواروں پر تعزیرات کی تمام دفعات سے محفوظ ہو کر اپنے خیالات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ تمام ملمع کاریوں سے مبرا۔

اسی چار دیواری کے ایک کونے میں عرصہ ہوا یہ فکر خیز تحریر دیکھی تھی ''تمہارے ہاتھ بھی کیسے کیسے کام کرتے ہیں'' اور دیواری مصوری کی اس خاص صنف میں آج کے نقاد ماڈرن سوئی ری لسٹک مصوری کی نمایاں جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

دیواروں پر لکھنے اور نقش و نگار بنانے کے لیے خاص روشنائی یا رنگوں کی ضرورت نہیں۔ کوئلہ، کھریا، مٹی، نیم پختہ اینٹ کا ٹکڑا، دودھ پتھری، گیری، چونا، کتھا، تارکول ان میں سے جو بھی Inspiration کے وقت موجود ہو۔ آپ

استعمال کر سکتے ہیں۔ قلم اور برش نہیں تو انگلی ہی سے کام لیا جا سکتا ہے اور اگر کوئی بھی ذریعہ میسر نہیں تو ناخنوں ہی سے کرید کرید کر آپ اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں۔

فارسی محاورہ ہے۔ دیوار ہم گوش وارد، لیکن جب دیواروں پر لکھا جاتا ہے تو اس کے کانوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ لکھنے والے اصل میں دیوار کے کانوں ہی میں سرگوشیاں کرتے ہیں تاکہ کان کی یہ کچی چیزیں جو کچھ سنیں دوسروں تک پہنچائیں۔

عرصہ ہوا لاہور سے پشاور تک سفر کرتے ہوئے فرنٹیئر میل کے ایک ڈبے کی چوبی دیوار پر میں نے یہ تحریر دیکھی تھی ''بجلی کے تاروں پر ابابیلوں کے جوڑے بیٹھے ہیں لیکن میرا پہلو خالی ہے، مجھ سے کوئی محبت نہیں کرتا'' ڈیڑھ مہینے کے بعد اتفاق سے لاہور واپس آتے ہوئے مجھے اسی ڈبے میں جگہ ملی۔ اس عبارت کے نیچے نسوانی خط میں یہ الفاظ لکھے تھے ''بدنصیب ہے وہ انسان جس کا دل محبت سے خالی ہے۔''

کیا عجب کہ یہ دونوں دل جو محبت سے خالی تھے ایک روز وقت کے تاروں پر مل بیٹھے ہوں۔

ہوٹلوں میں آپ نے اکثر دیواروں پر یہ شعر دیکھا ہوگا

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اگر آپ غریب الوطن ہیں تو یہ تحریر دیکھ کر یقیناً آپ کا دل محزون ہو جائے گا دیواروں سے بعض اصحاب ڈائری کا کام بھی لیتے ہیں۔ ٹیلی فون کے برابر کی

دیوار پر آپ نے کئی نمبر اور نام یادداشت کے طور پر لکھے ہوئے دیکھے گے۔ ہاسٹل کے کمروں کی دیواروں پر ایسی تحریریں عام دکھائی دیتی ہیں۔ 2-6-45 کو دودھ شروع کیا گیا۔ دھوبی کو کپڑے دیئے گئے 4-7-45

بمبئی کے ایک ہوٹل میں جہاں عام طور پر جہاز کے خلاصی ٹھہرتے تھے۔ میں نے بادبانوں، مستولوں اور جھنڈوں کی تصویروں کے ساتھ ساتھ ذیل کی تحریریں دیکھیں جو اپنا مطلب خود واضح کرتی ہیں۔

کل من علیھا فان

فرانس، فرانس، فرانس میموزیل نینی

ہائے!

سیرت کے ہم کلام ہیں سورت ہوئی تو کیا

پانچوں وقت نماز پڑھا کرو

او جانے والے بالموالوٹ کے آ، لوٹ کے آ

بقلم خود جان محمد 4-9-47

بقلم خود لکھنے کا شوق بہت زیادہ ہے شاید اس لیے کہ اس سے وقتی طور پر انسان کو خودی کی تسلی ہو جاتی ہے۔ جس طرح ہمالہ کی چوٹیاں مسخر کرنے پر سیاح اپنے جھنڈے گاڑ آتے ہیں۔ اسی طرح کوئی نئی جگہ دیکھنے پر ہم چھوٹے چھوٹے انسان اپنا نام لکھ آتے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی قطب صاحب کی لاٹھ کی آخری منزل تک پہنچنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں تانبے کے کڑے اور پتھروں پر ہزاروں بقلم خود کنندہ ہیں۔ امریکی، روسی اور انگریز سپاہیوں نے جب

رائخ شٹاگ کی عمارت پر قبضہ کیا تو اس کی دیواروں پر اپنا نام لکھنے میں فاتحانہ مسرت محسوس کی۔

دیواروں پر قسمت بھی آزمائی جاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے ہوٹلوں، گھروں اور سکولوں کی دیواروں پر چارلکیروں میں گھرے ہوئے چلیپا کے نشان اور دائرے اکثر دیکھے ہوں گے۔ حساب کے سوال بھی حل کئے جاتے ہیں۔ سیاست کی گتھیاں بھی سلجھائی جاتی ہیں اور اپنے دل کی بھڑاس بھی نکالی جاتی ہے۔

مجھے مشہور ایکٹر اشوک کمار کے باتھ روم میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کی ایک دیوار پر بے شمار گھوڑوں کے نام، ان کے وزن اور ہینڈی کیپ وغیرہ لکھے تھے۔ اشوک نے مجھ سے کہا کہ ریس میں جانے سے پہلے وہ اسی دیوار پر سے اپنے لیے ٹپ نکالا کرتا ہے۔

قلوپطرہ کو ابھی میٹھا برس لگا تھا جب سکندریہ میں یہ رواج عام تھا کہ عشاق اپنی پسندیدہ عورت کا نام دیوار پر لکھ دیتے تھے۔ اپنا نام پڑھ کر عورت سولہ سنگھار کئے اپنے عاشق کے انتظار میں وہاں کھڑی رہتی تھی۔ انسان کے دیواروں پر لکھنے اور نقاشی کرنے کے اس فطری شوق ہی کی بدولت اجنتا اور ایلورا کے فرسکو نظر آتے ہیں۔ اس کی معراج دیکھنا ہو تو روما کے عظیم الشان کلیساؤں کی دیواروں کے نہ مٹنے والے نقش موجود ہیں۔ سچ پوچھئے تو یورپ کے فن مصوری کا نصف بہتر آپ کو وہاں کی دیواروں کو نہ مٹنے والے نقش موجود ہیں۔ سچ پوچھئے تو یورپ کے فن مصوری کا نصف بہتر آپ کو وہاں کی دیواروں پر ہی ملے گا اور مغلوں کی بے مثل خطاطی، نقاشی اور مصوری کے نمونے بھی دیواریں ہی پیش کریں گی۔

اشتہار بازی میں بھی تحریریں پیش پیش ہیں۔ شہر لاہور کی شاید ہی کوئی ایسی دیوار ہو جس پر آپ کو اشتہار لکھا ہوا نظر نہ آئے۔ بال صفا پاؤڈر سے لے کر اگانے کے تیل تک جتنی دوائیں ہیں۔ آپ ان کا اشتہار دیواروں پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

پطرس صاحب نے اپنے مشہور مضمون ''لاہور کا جغرافیہ'' میں دیواروں کی سطح پر لکھے ہوئے اشتہاروں کے فوائد بیان کئے ہیں۔

ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹنے تک وہاں اہل لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں بحروف جلی ''محمد علی دندان ساز'' لکھا ہے وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے جہاں ''بجلی، پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال'' لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں خالص گھی کی مٹھائی امتیاز علی تاج کا مکان ہے۔ کرشنا بیوٹی کریم شالامار باغ کو اور ''کھانسی کا مجرب نسخہ'' جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

بمبئی میں کارپوریشن نے ایک بہت لمبی دیوار جو کوئینز روڈ پر واقع ہے اور برقی ریل کی پٹڑی کے متوازی دور تک چلی گئی ہے۔ اشتہاروں کے لیے مخصوص کر دی ہے۔ اس دیوار کے پیچھے پارسیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا قبرستان اور ہندوؤں کا شمشان ہے۔ معلوم نہیں مذہبی نقطہ نظر سے بمبئی کارپوریشن کی حرکت درست ہے یا نادرست مگر یہ دیوار جس پر ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک فلموں کے بڑے بڑے اشتہار پینٹ ہیں، ایک عجیب و غریب تضاد پیش کرتی

ہے۔عقب میں ہزاروں انسان دفن ہیں لیکن پیشانی پر پری چہرہ نسیم بانو کی یہ بڑی تصویر نظر آتی ہے۔ ذرا آگے بڑھیے تو موٹے موٹے حروف ہیں ''ہنسو ہنسوائے دنیا والو'' کا اشتہار دکھائی دیتا ہے۔ دیوار کے پیچھے جلتی ہوئی چتا سے دھواں اٹھ رہا ہے لیکن سامنے نیو تھیٹرز کے فلم ''زندگی'' کا شوخ رنگ اشتہار چمک رہا ہے۔

پچھلے دنوں السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں اسی دیوار کو متعدد رنگین تصویریں ایک مضمون کے ساتھ شائع ہوئی تھیں جس میں اشتہاری مصوری کی اس جدید صنف کو بہت سراہا گیا تھا۔ لیکن بچپن میں ہم جب چیچو چیچ گلیریاں، دو تیریاں دو میریاں کا دلچسپ کھیل کھیلتے تھے اور دیواروں پر کوئلے سے ان گنت لکیریں کھینچتے تھے تو بزرگوں نے ہمارے اس فعل کو ہمیشہ مذمت کی۔

ادھر روس میں ان دیواروں تحریروں نے انقلاب میں بیش از بیش حصہ لیا۔ پریس پر حکومت کا بہت بڑا احتساب تھا اس لیے دیواروں ہی کے ذریعے سے اخباروں اور پمفلٹوں کا کام لیا گیا۔ اس ذریعے نے بعد میں شکل بدلی اور مزدوروں کا ''دیواری اخبار'' یا ''وال پیپر'' بن گیا۔

جب تک دیواریں سلامت ہیں ان پر انسان لکھتا اور نقش و نگار بناتا ہی رہے گا لیکن پچھلے دنوں اس نے ایک قدم ترقی کی طرف بڑھایا اور فضاؤں پر لکھنا شروع کیا۔ پیئر زسوپ بنانے والوں نے ایک ہوا باز کی خدمت حاصل کیں جس نے جہاز کی دم سے گاڑھا دھواں چھوڑ کر کچھ اس طرح قلابازیاں کھائیں کہ فضاء میں اس صابن کا دھواں دھار نام کچھ عرصے کے لیے معلق ہو گیا۔

بمبئی میں جب اس فضائی اشتہار بازی کا مظاہرہ ہوا تو کارپوریشن نے پیئرز

سوپ بنانے والوں سے فضاء استعمال کرنے کا کرایہ طلب کیا معاملہ عدالت تک پہنچا فیصلہ کارپوریشن کے حق میں ہوا کہ فضاء بھی اس کے حلقہ انتظام میں شامل ہے۔

☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ناک کی قسمیں

خدا نے جس طرح پانچ انگلیاں یکساں نہیں بنائیں اسی طرح انسانوں کی ناک بھی ایک سی نہیں بنائی بعض چپٹی ہوتی ہیں، بعض اونچی، کچھ موٹی، کچھ پتلی چھوٹی اور لمبی اور بعض اوقات اتنی لمبی کہ

آئی جو ان کی ناک تو آتی چلی گئی

اس ناک کے مقابلے میں پھلکی سی ناک ہوتی ہے۔ چہرے پر جو صرف ناک کے نشان کا کام دیتی ہے۔ ایسی ناکوں کے مالک بڑے کٹر قسم کے رجائی ہوتے ہیں کیونکہ وہ اسی امید کے سہارے سانس لیتے رہتے ہیں کہ ایک روز صبح اٹھتے ہی یہ بے معلوم سا نشان ستواں ناک میں تبدیل ہو جائے گا۔

عام استعمال میں پھلوں یعنی پھولی ہوئی چپٹی بیٹھی ستواں اور اونچی ناک ہی آتی ہے لیکن شاعروں کو صرف ستواں ناک ہی بھاتی ہے۔ کبھی اسے اپنی تلوار سے تشبیہہ دی جاتی ہے، کبھی کتارا یعنی املی کی پھلی سے۔ لیکن تلوار اور ناک کا رشتہ کچھ زیادہ ہی استوار ہی اس لیے کہ دشمنی کے وقت تلوار ہی اس کے درپے ہوتی ہے۔ دشمن کی ناک کاٹنے کا تو رواج عام ہے۔

یوپی کے دیہاتوں میں خوبصورت ناک کو سوئے سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے ہمارے سبزہ باغ میں سوا چونچ کہئے ہیں شاید نظر کے تیروں کے علاوہ وہاں ناک کے سوئے بھی عاشقوں کے دل میں پیوست ہوتے ہیں۔

پنجابی شاعر تشبیہہ دینے کے معاملے میں ہمیشہ ترقی پسند رہے ہیں۔ چنانچہ

ایک شاعر نے کہا ہے ''نک تھوم دی تر ی''یعنی ناک لہسن کی تُری ہے ہوسکتا ہے شاعر نے اپنے معشوق کے چہرے کو پکی ہوئی دال سمجھ کر لہسن کا بگھار دے دیا ہو۔

پنجابی شاعری کے ناخدا حضرت وارث شاہ پنجاب کی مثالی مشوقہ ہیر سیال کا سراپا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

ہونٹھ سرخ یاقوت جیویں لال چمکن، ٹھوڈی سیب ولایتی

سارو چوں

نک الف حسینی دا پپلڑے، زلف ناگ خزانے دی بار وچوں

ہیر کی اس ناک کو اگر گراپی تلوار، املی کی پھلی، لہن کی تُری اور سوئے میں خلط ملط کر دیا جائے تو چغتائی ناک بن جاتی ہے۔خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی کے مو قلم کی ایجادا سے دیکھ کر اللہ اور اس کے بندے، دونوں کی قدرت یاد آجاتی ہے۔

شروع شروع میں ناک کا مصرف سونگھنا تھا چنانچہ حیوانوں میں ابھی تک اس کا ذوق صحیح موجود ہے۔کتے اپنے روزمرہ کی زندگی میں زیادہ تر قوت شامہ ہی سے کام لیتے ہیں لیکن چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لیے اس نے جوتے اور کپڑے سونگھنا متروک قرار دیا اور اپنے لیے عریات بنا لیے۔چنانچہ اونچی سوسائٹی میں لونڈر اور سینٹ کے انتخابات ہی سے انسان کے مذاق کی بلندی و پستی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

ناک سونگھنے ہی کے لیے تھی اور کسی حد تک اب بھی ہے لیکن اب اس کے اور استعمال بھی نکل آئے ہیں عورتیں ایک زمانہ سے اسے چھدوا رہی ہیں۔شروع شروع میں دونوں طرف بڑے سوراخ کرانے اور بڑی بڑی نتھیں پہننے کا رواج

تھا۔ آہستہ آہستہ ایک سوراخ جسے بے کہتے ہیں کم ہوا اور ساتھ ہی ساتھ نتھوں کا سائز بھی چھوٹا ہو گیا۔ اونچی سوسائٹی میں ان دنوں ناک چھدوانے کا رواج بہت معیوب ہے۔ ایک ازدواجی اشتہار ملاحظہ ہو:

''ضرورت ہے ایک اونچے گھرانے کی ناکتخدا تعلیم یافتہ خوش شکل لڑکی جس کی ناک چھدی ہوئی نہ ہو۔''

اونٹوں کی اونچی نیچی سوسائٹی میں ایسی کوئی پابندی نہیں چنانچہ ناک چھدوانے اور نکیل پہننے کا رواج ان کے ہاں عام ہے۔

عورتوں کی ناک کے حسن کی افزائش کے لیے بے شمار زیور ایجاد ہوئے جن میں نتھ، کیل، بلاک، (یہ ناک کی درمیانی دیوار کو چھید کے پہنا جاتا ہے) اور لونگ مشہور ہیں۔

ایک ''لونگ پہنی مٹیار'' کے بارے میں پنجاب کے کسی دیہاتی کی یہ بولی بہت مشہور ہے۔

تیرے لونگ دا پیا لشکارا
تے ہالیاں نے ہل ڈک لے

تیری لونگ نے جب چمک پیدا کی تو ہل چلانے والوں نے اس خیال سے اپنے ہل روک لیے کہ بجلی چمکی ہے ممکن ہے بارش ہونے لگے

بعض ناکوں کو زیور کی حاجت ہی نہیں ہوتی ایک شاعر کہتا ہے

ناک میں نیم کا فقط تنکا
شوخی چالاکی اقتضا سن کا

پچھلے پچاس ساٹھ برس سے ناک کا ایک اور بھی مصرف معلوم ہوا ہے چنانچہ آنکھوں کی بینائی درست کرنے کے لیے جب عینک ایجاد ہوئی تو اسے ناک پر بٹھا دیا گیا۔ سیدھا راستہ بتانے میں تو عام طور پر اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ''ناک کی سیدھ چلے جایئے''

پرائمری سکول میں جب کسی استاد کو اپنے شاگرد کے طمانچہ لگانا ہوتا ہے تو وہ سہولت کی خاطر اپنا ہاتھ گال پر اچھی طرح جمانے کے لیے اس کی ناک دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے لیکن مغربی ممالک میں ہمارے پرائمری سکولوں کے استاد کی اس پچ سے ابھی تک استفادہ نہیں کیا گیا۔ ایران میں البتہ جب کسی معتوب کو محفل سے باہر نکالنا مقصود ہو تو بیک بینی و دو گوش باہر نکالا جاتا ہے لیکن ہمیں تو ناک کی قسمیں بیان کرنی ہیں۔

بڑی ناک، اونچی ناک، پھلواں ناک، چپٹی ناک، بیٹھی ناک اور پھلکی سی ناک کا شمار جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، خوبصورت ناکوں میں نہیں ہوتا لیکن محاورے میں بڑی اور اونچی ناک کا مرتبہ بہت بلند ہے چنانچہ جب کسی کے بارے میں کہا جائے کہ وہ بڑے نام والے، بڑی ناک والے ہیں تو ہمارا سر ہماری ناک سمیت احترام سے جھک جائے گا۔

بڑی اونچی ناک حسن کی علامت ہو نہ ہو عزت کی نشانی ضرور ہے چنانچہ ایسی ناک پر مکھی بالکل نہیں بیٹھنے دی جاتی۔ اگر آپ کو کوئی ایسی ناک نظر آ جائے جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں تو آپ کو فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا مالک ذلیل و خوار آدمی ہے۔

ناکوں کی مختلف شکل وصورت کے متعلق پروفیسر ٹامسن اور مسٹر بکٹسن ہی ہماری رہبری کرتے ہیں۔ان حضرات کی تحقیق وتدقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اس عضو پر موسم خاص طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اس کی تشکیل میں چنانچہ یہی کارفرما ہیں۔ پروفیسر ٹامسن کے نظریئے کے مطابق گرم اور مرطوب آب وہوا میں رہنے والوں کی ناک اونچی ہوتی ہے لیکن پروفیسر صاحب اپنی تحقیق میں اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکے کہ ایسی آب وہوا میں رہنے والے باوقار اور باعزت لوگ ہوتے ہیں۔

تاریخی ناکوں میں دو ناکیں بہت مشہور ہیں۔ ایک ناک تو وادی نیل کی معشوقہ قلوپطرہ کی تھی جس کے متعلق یہ دیر تک سوچا جاتا رہا ہے کہ اگر یہ ایک انچ کا آٹھواں حصہ بڑی ہوتی تو عیسائیوں کی تاریخ تمدن بالکل مختلف ہوتی۔قلوپطرہ کی اس تاریخی ناک کو حیرت ناک کہتے ہیں۔کیوں کہ اس کے تصور ہی سے لوگ ورطہ حیرت میں غرق ہو جاتے ہیں کہ ایک عورت کی ناک قوموں کی قسمت میں نکیل ڈالنے کا باعث کیوں کر ہوسکتی ہے؟

دوسری ناک کو ہولناک کہتے ہیں یہ بھی مصر ہی کی پیداوار ہے اور ابوالہول کے سنگین چہرے پر حضرت مسیح کی پیدائش سے بہت پہلے کی بیٹھی ہوئی ہے۔

ان دو ناکوں کے علاوہ اور کوئی تاریخی ناک نہیں جس کا ہمیں علم ہو۔عبرت ناک البتہ ہم نے اکثر آوارہ اور بدچلن عورت کے چہرے پر دیکھی ہے۔غیرت مند شوہر جب بھی اپنی بدچلن بیوی کو سزا دیتا ہے۔ایسی عبرت ناک معرض موجود میں آجاتی ہے۔ایسی ناکوں کو جنہیں سوسائٹی میں ہر قدم پر کٹ جانے کا خطرہ

لاحق رہتا ہے۔خطرناک کہلاتی ہیں۔

تشویش ناک بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہے لیکن جب نظر آجائے تو بعض دیکھنے والوں کی ناک کو تشویش پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر کہیں ہے تو ممکن ہے کہ ہونٹوں کی جنبش میں وہ خود ہی غائب ہو جائے۔ سنکتے وقت جو ناک بہت شور مچائے، وہ شورش ناک کے نام سے مشہور ہو جاتی ہے۔

نم ناک سے تو ہر ایک کو واسطہ پڑ جاتا ہے۔نزلے اور زکام کی حالت میں اچھی، اچھی سے طرحدار ناک، نم ناک بن جاتی ہے کہ دیکھنے والوں کی اپنی ناک مارے وحشت کے وحشت ناک ہو جاتی ہے۔

نئی نئی چھدی ہوئی ناک جس کی بے میں سوجن ہو درد ناک کہلاتی ہے اور رحم ناک اس ناک کو کہتے ہیں جو سردیوں میں اکیلے پڑی ٹھٹھر رہی ہو جس کے دوسرے اعضاء تو گرم گرم کپڑوں میں ڈھکے ہوں اور یہ بے چاری تن تنہا سردی کے طمانچے کھا رہی ہو۔ ایسی ناک جسے دیکھ کر دل میں افسوس پیدا ہو کہ ہائے انسان کے چہرے پر ایسی ناک بھی ہو سکتی ہے۔افسوس ناک کہلاتی ہے افسوس کی حد سے گزر جائے تو اندوہ ناک ہو جاتی ہے لیکن وہ خوبصورت ناک جو غضب ڈھا رہی ہو، غضب ناک کہلائے گی۔

فریب ناک عام طور پر طوائفوں کے چہرے پر پائی جاتی ہے۔نتھنی کتنی دفعہ اتر چکی ہے اس کا پتا تماش بین حضرات کو ان ناکوں سے کبھی نہیں چلا۔فریب کھا کر ان تماش بین حضرات میں سے اکثر کی ناک خشمناک ہو جاتی وہ گی لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے۔

مسنتے کہ بعد از جنگ یا دمی آید بر بنی خود باید زد

شرم سے عام طور پر انسان کی پیشانی عرق آلود ہوتی ہے لیکن اگر شرم کا احساس بہت ہی شدید ہو تو ناک پر بھی پسینے کی بوندیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ ایسی ناک کو شرمناک کہا جائے گا اور وہ ناک جس کے تصور ہی سے خوف و ہراس طاری ہو جائے، خوف ناک کہلائے جانے کی مستحق ہے۔

چکنی اور چمکیلی ناک کا شمار خاندانی ناکوں میں نہیں ہوتا۔ انگریزی سوسائٹی میں تو خاص طور پر ایسی ناک بہت ہی بری قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ ان کی چکناہٹ اور چمک دور کرنے کے لیے آئے دن دوائیں ایجاد ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے یہاں ایسی ناک کو تابناک کہتے ہیں۔ اس لیے کہ دوسری غیر چمکیلی ناکیں اب ان کی تاب نہیں لا سکتیں۔

ایک ناک جو حال ہی میں مولانا چراغ حسن حسرت نے دریافت کی ہے خضر ناک ہے۔ خواجہ خضر کی بند ناک سے جس کے نتھنوں میں پانی گھستا ہی نہیں۔ اس ناک کا کوئی تعلق نہیں یہ ناک صرف **ملک** خضر حیات خاں ٹوانہ، سابق وزیر اعظم پنجاب کے چہرے پر ہے۔ سیاست کے اکھاڑے میں بہت بری طرح مکے اور گھونسے کھانے کے بعد آج کل یہ لندن میں اونچی ہونے کی کوشش کر رہی ہے لیکن پروفیسر ٹامسن اور مسٹر بکسٹن کی تحقیق کے مطابق سرد ملکوں میں ناک کے پنپنے کے کچھ زیادہ امکانات نہیں ہیں۔

برقیہ: یہ مضمون اشاعت کے لیے پریس میں جا رہا تھا کہ لندن سے **ملک** خضر حیات کا برقیہ موصول ہوا آپ لکھتے ہیں کہ مولانا چراغ حسن حسرت کی ناک کو ہر

گزر فراموش نہ کیا جائے کیوں کہ ایسی حسرت ناک والٹیر کے بعد صرف انہی کے حصے میں آئی ہے۔

حسرت ان ناکوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئیں

☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

کھانسی پر

ہمارے یہاں جب کوئی طبیب اپنا کام شروع کرتا ہے تو بسم اللہ کر کے وہ سب سے پہلے مردوں کی قوت مردمی کے لیے نسخہ ایجاد کرتا ہے جس کو مجرب ثابت کرنے کے واسطے وہ خدا اور اس کے رسول کی قسمیں کھا کھا کر ساری عمر اشتہار دیتا رہتا ہے۔ یورپ میں جب کوئی فرم دوا سازی کا کام شروع کرے گی تو وہ سب سے پہلے کھانسی کی تیر بہدف دوائی ایجاد کرے گی اور باپ بیٹے اور روح القدس کو حاضر ناظر جانے بغیر اس کے حیرت انگیز اثر کا اشتہار دیتی رہے گی۔

کھانسی کے لیے اب تک جتنی انگریزی دوائیاں ایجاد ہوئی ہیں اور کسی بیماری کے لیے نہیں ہوئیں۔ سنا ہے کہ یہ مرض بہت پرانا ہے اور سب سے پہلے اماں حوا کو ہوا تھا۔ تحقیق و تدقیق کرنے والے اس نظریئے کے جواز میں عورت کے ترشی پسند جبلی میلان کو پیش کرتے ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ عورتیں مردوں کی بہ نسبت کھٹی چیزیں زیادہ رغبت سے کھاتی ہیں۔ تجربے کے طور پر اگر آپ مردوں اور عورتوں کی ملی جلی محفل میں اپنی جیب سے املی کی پھلی نکالیں تو سب سے پہلے عورتوں کے منہ میں پانی بھر آئے گا۔

اس مرض کا آغاز عورت سے ہوا تھا یا مرد سے اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں کیونکہ یہ بیماری آج کل دنیا میں کافی مقبول ہے اور امکان یہی ہے کہ آنے والی نسلوں میں اس کی مقبولیت اور بھی زیادہ بڑھ جائے گی۔ کھانسی سے شغف رکھنے والے ماہرین اعداد و شمار سے ثابت کر چکے ہیں کہ ہم پرانی نسل کے مقابلے میں

زیادہ کھانستے کھنگارتے ہیں اور یہ بات بھی پایہ تصدیق کو پہنچ چکی ہے کہ کھانسی صرف اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ اس کا علاج کیا جائے۔

کھانسی کے بے شمار علاج ہیں طبیبوں کے لبوب ہیں۔قرص ہیں،شرب ہیں، معجونیں ہیں، دھونیاں ہیں، جوشاندے ہیں،فقیروں اور درویشوں کی چٹکیاں، تعویذ اور ٹونے ٹوٹکے ہیں۔ایلو پیتھک اور ہومیو پیتھک کی ہزار ہا دوائیں ہیں اور اگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والا معاملہ ہے تو پھانسی موجود ہے، نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

عرصہ ہوا ایک شخص نے جو پھانسی کے پھندے سے بچ نکلا تھا۔اپنے تجربے کے پیش نظر نظریہ ضرب المثل ایجاد کی تھی کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔حال ہی میں ایک اور شخص نے پھانسی کے پھندے سے بچ کر پریس کانفرنس میں اپنا بیان دیا ہے کہ کھانسی پھانسی پر بھی آجاتی ہے ثابت ہوا کہ یہ بت بری بلا ہے اس لیے خداوند کریم کو چاہیے کہ وہ سب کو اس سے محفوظ رکھے آمین ثم آمین۔

لیکن جو شخص اس مرض میں لاحق ہو جائے اس کو سب سے پہلے اس کے رنگ ونسل پر غور کرنا چاہیے۔کیونکہ معلوم ہوا کہ اس کی ایک نہایت ہی ادنی ذات جسے کالی کھانسی کہتے ہیں، بہت ہی خطرناک ہوتی ہے۔اس کے مقابلے میں گوری کھانسی کو لیجئے، بہت ہی بے ضرر قسم کی ہوتی ہے۔جس طرح سفید فام انگریز، جس کو لاحق ہوتی ہے اسے زیادہ تکلیف نہیں دیتی۔اس کا مریض ہولے ہولے کھانستا اور اسی طرح لگے بندھے سبتک کے اندر کھانستا کھانستا جاں بحق تسلیم ہو جاتا ہے اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دیتا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اب کالی کھانسی کو لیجئے جسے حقارت کے طور پر کتا کھانسی بھی کہتے ہیں۔ اس کا مریض دن کو تو خاموش رہتا ہے لیکن رات کو چونکہ دوسروں کو آرام کی نیند سونا ہوتا ہے، بھونکنا شروع کر دیتا ہے لیکن ہندوستانی اور پاکستانی گائکوں اور موسیقاروں نے بیک تان فیصلہ دیا ہے کہ کالی کھانسی اور کتے کی عف عف صوتی اعتبار سے کوئی مماثلت نہیں رکھتی۔ کالی کھانسی کھانسنے والا دوسرے کالے سے شروع کرتا ہے اور کتا چوتھے کالے سے کتوں نے فی الحال اس معاملے میں اپنی رائے کسی موزوں وقت کے لیے محفوظ رکھ چھوڑ ہے لیکن کانوں میں اتنی بھنک ضرور پڑی ہے کہ وہ اپنی بدترین قسم کی کھانسی کا نام انسانوں کی کھانسی رکھنے کا ریزولیوشن پاس کرنے والے ہیں۔

انسان رنگ و نسل کی تمیز حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہتا ہے لیکن اس کے جسمانی امراض میں رنگوں کی تمیز بدستور موجود ہے۔ کالا آزار کو لیجئے، یرقان کو لیجئے۔ موخر الذکر کی بیماری بھی زرد رنگ ہونے کی وجہ سے گھٹیا قسم کی بیماریوں میں شمار ہوتی ہے۔ کالی کھانسی کا تو خیر کھانسیوں میں وہی درجہ ہوتا ہے جو ہندوؤں میں اچھوت کا ہوتا ہے۔ اسے کہتے تو چھوت کی بیماری ہیں لیکن اس سے سلوک وہی روا رکھا جاتا ہے جو اچھوتوں کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ چنانچہ کالی کھانسی کھانسنے والے انسانوں سے دوسرے رنگوں کی کھانسی کھانسنے والے بھی پرہیز کرتے ہیں اور ان سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کالی کھانسی چونکہ نیچ ذات ہے اس لیے عام طور پر اس کا حملہ کم سن بچوں پر ہوتا

ہے بے چارے مہینوں بستر پر ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہتے ہیں۔ کھانس کھانس کر ہلکان ہو جاتے ہیں۔ غوطے پہ غوطے آتے ہیں، اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جاتا ہے مگر یہ کم بخت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بچے اس کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کی نیند سو جاتے ہیں۔ اگر بچہ کسی بڑے آدمی کا ہوتا ہے تو اخباروں میں مرض کے رنگ کی مناسبت سے سیاہ چوکھٹے کے اندر ''حادثہ جانکاہ'' کے عنوان سے اس کی موت کا اعلان چھپ جاتا ہے اور یہ شعر لکھ دیا جاتا ہے۔

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

کالی کھانسی کی ابتداء سنا ہے افریقہ کے ایک حبشی نے کی تھی مگر حبشی نہیں مانتے اس لیے کہ یہ دریافت سفید نسل کے ایک آدمی سے منسوب ہے۔

کھانسی کی بے شمار قسمیں ہیں۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے اسی طرح وقت وقت کی کھانسی ہوتی ہے لیکن بے وقت کی کھانسی بہت ہی بے ڈھب مانی گئی ہے۔ سب آدمی سو رہے ہیں۔ چاروں طرف خاموشی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ الماری کھول کر اس میں سے کچھ روپیہ یا چند زیور نکال لیں۔ آپ کا حلق آپ کی نیت کی طرح بالکل صاف ہے۔ خراش کا نام و نشان نہیں، پھیپھڑے بھی ماشاءاللہ ٹھیک ٹھاک ہیں، گرد و غبار کا بھی کوئی امکان نہیں لیکن دفعتہً آپ کے گلے میں گدگدی شروع ہو جائے گی۔ آ لاکھ دبانے کی کوشش کریں لیکن یہ بن بلائی کھانسی آ کے رہے گی۔

حلق اچھا بھلا صاف ہوگ۔ انزخرے میں کسی قسم کی آلائش نہیں ہوگی لیکن جب آپ تقریر کرنے کے لیے اٹھیں گے معزز حضرات! کھوں کھوں۔۔۔۔ معزز حضرات۔۔۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ معزز حضرات کھوں کھوں۔

ایسے اوقات میں ایلو پیتھک، ہومیو پیتھک اور یونانی طریقہ علاج کے تمام ماہرین نے متفقہ طور پر یہ نسخہ تجویز کیا ہے کہ تقریر کرنے والا اگر معزز حضرات کے آوازوں سے جانبر ہو جائے تو خودکشی کر لے۔

ایک کھانسی کا ظہور عین وقت نماز ہوتا ہے۔ محمود و ایاز صف باندھے کھڑے ہیں۔ دھیان اللہ کی طرف ہے۔ ایک دم کچھ ہوگا اور محمود کے حلق سے کھوں نکل جائے گی۔ ایاز جو کہ چوتھی صف میں آخری سرے پر سر نیہوڑے کھڑا ہے۔ اپنے حلق میں ئیلی پیتھی محسوس کرے گا اور غیر ارادی طور پر اس کے حلق سے بھی ایک عدد کھوں باہر سرک جائے گی۔ اس کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی چونکہ نہیں تھا اس لیے لازماً خداوند حکیم کے پاس ہوگا۔

ایک کھانسی حقے کی کھانسی ہے۔ اس کو کھانسنے والے حضرات منہ اندھیرے اٹھ کر خدا کا نام لیتے ہیں نہ رسول کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنا حقہ تازہ کرتے ہیں اور چلم بھروا کر اولیں کش لیتے ہیں کھانسنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کھانستے کھانستے منہ سرخ ہو جائے گا، گلے کی رگیں ابھر آئیں گی، چھاتی دھونکنی کی طرح چلنے لگے گی مگر وہ حقے کے لقے کھینچتے جائیں گے۔ ان حضرات کا بیان ہے کہ آدمی جتنا زیادہ کھانسے اتنا ہی زیادہ ثواب ہوتا ہے۔

حقہ کھانسی کھانسنے والے جب بڈھے ہو جاتے ہیں تو ایک ہی کش ان پر چودہ طبق روشن کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے چنانچہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ پہلا کش لے کر یہ بزرگ ایک دفعہ کھوں کھوں کرتے ہی مراقبے میں چلے جاتے ہیں اور تقریباً ایک گھنٹے تک اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رکھنے کے بعد دوسری کھوں کرنے کے لیے ہوش میں آتے ہیں۔

کھانسی برائے کھانسی ہے یا کھانسی برائے زندگی ہے۔اس پر ایک زمانہ سے بحث ہو رہی ہے۔دو سکول بن گئے ہیں۔ایک کہتا ہے کہ انسان کو صرف کھانسنے ہی کے لیے کھانسنا چاہیے۔دوسرا کہتا ہے نہیں انسان کو اپنی زندگی کے لیے کھانسنا کھنکارنا چاہیے۔موخر الذکر سکول کے پیرو چنانچہ بسا اوقات لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے کھانسی ہی سے کام لیتے ہیں۔دوست جا رہا ہے، حلق سے تھوڑی سی خرخراہٹ پیدا کی ''کھوں کھوں کہیے جناب کیا حال ہے؟''

پاخانے میں محو اجابت دروازی میں کنڈی نہیں ذرا آہٹ ہوئی تو کھانس دیا مطلب یہ کہ نو ویکنسی!

دور کوٹھے پر کھڑی ایک عورت اپنے بال سکھا رہی ہے پیٹھ آپ کی طرف ہے جی چاہتا ہے کہ اس کی شکل دیکھی جائے گلے میں ذرا سرسراہٹ پیدا کی اور تیکھی سی کھوں ہواں میں پھینک دی۔یوں چٹکی بجاتے میں مطلب حل ہو جاتا ہے۔

آپ کے دوست کے ساتھ ایک عورت جا رہی ہے۔معلوم نہیں اس کی بہن یا ماں۔لیکن چونکہ آپ کو اس پر جتانا ہے کہ وہ ایک عورت کے ساتھ جانے کی عیاشی کا مرتکب ہو رہا ہے اس لیے آپ بلا تکلف ایک یا دو مرتبہ کھوں کر کے اپنا فرض

منصبی ادا کر سکتے ہیں۔

ایک کھانسی خلاصتہ گویوں کی کھانسی ہے جیسے فیشن کے طور پر استعمال کی جاتی ہے محفل جمی ہوئی ہے آپ ہارمونیم کی پیٹی اپنے گانے والے دوست کی طرف بڑھاتے ہیں اور کچھ سنانے کی فرمائش کرتے ہیں وہ ضرور اپنا ہاتھ گلے کی طرف لے جائے گا اور اسے دبا کر آپ سے کہے گا ''مجھے کئی دنوں سے کھانسی کی شکایت ہے کھوں کھوں دیکھ لیا۔''

سنا ہے کہ میاں تان سین اور بیجو باورے نے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی تھی کہ فرمائش پر فوراً ہی گانا شروع کر دینا ہلکا پن ہے اس لیے کھانسی اور زکام کی شکایت کا بہانہ کرنا لازم ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر سر غلط ہو جائے تو فوراً کھانسی کو مجرم قرار دیا جا سکتا ہے۔

عادت پک کر طبیعت بن جاتی ہے چنانچہ گانے والے جب ریاض بھی شروع کرتے ہیں تو استاد کا نام لے کر ایک دو بار کھانس کھنکار لیتے ہیں۔

بعض اوقات کچھ کھاتے یا پیتے ہوئے ایک دم ایسی کھانسی اٹھتی ہے کہ لقمہ اور گھونٹ پھوں کر کے ناک، کان اور منہ کے رستے باہر نکل آتے ہیں اور پھر کچھ اس قسم کی کھوں کھاں شروع ہوتی ہے کہ آدمی سمجھتا ہے بس کام تمام ہوا لیکن دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر کام تمام نہیں ہوتا۔ خاص طور پر کیا ہوتا ہے اس کے متعلق خواص عوام سے بہتر جانتے ہیں۔ کھانسی کے اس ناگہانی حملے کو اردو ئے معلی میں ''اچھو'' کہتے ہیں۔

کھانسنے کھنکارنے اور اس عمل سے بلوئے ہوئے بلغم کے ذریعے سے فرشوں

اور دیواروں پر پلستر کرنے ارہیل بوٹے بنانے کی صفت کسی زمانے میں ہمارے یہاں معراج پر تھی لیکن انگریزوں کی ایک سو سالہ حکومت میں اس سے اچھا سلوک نہ ہوا۔ پر اب کہ لاتعداد قربانیاں دینے کے بعد خدا کے فضل و کرم سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ ہمیں اس صحت مند صفت کو بام رفعت تک پہنچانے کے لیے مقدور بھر کوشش کرنی چاہیے۔

☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

سوال پیدا ہوتا ہے

معزز خواتین اور معزز حضرات ذلیل عورتوں اور ذلیل مردو، با ادب با ملاحظہ ہوشیار!!۔۔۔آپ سب کو بروقت آگاہ کیا جاتا ہے کہ ایک سوال پیدا ہو رہا ہے۔ حبوط آدم سے لے کر اب تک اتنے ہی سوال پیدا ہو چکے ہیں جتنے آسمان میں تارے ہیں لیکن پھر بھی آئے دن پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔کوئی اٹھ کر یا بیٹھ کر یہ نہیں کہتا کہ اب مزید سوال پیدا نہیں ہونے چاہئیں۔

آبادی گھٹانے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ بھونچال پیدا کرتا ہے،لڑائیاں پیدا کرتا ہے،قحط پیدا کرتا ہے، پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان پیدا کرتا ہے،برتھ کنٹرول کے نت نئے طریقے انسانوں کو سمجھاتا ہے مگر وہ سوالوں کی جمع در جمع اور ضرب در ضرب کی طرف توجہ نہیں دیتا۔

سوال ہر جگہ پیدا ہوتا ہے اور ہر مقام پر پیدا ہو سکتا ہے اس کے لیے خاص موسم کی، خاص مٹی کی، خاص پانی کی، کھاد کی، ہل کی، ٹریکٹر کی، کوئی ضرورت نہیں، بچہ نو مہینے کے بعد پیدا ہوتا ہے لیکن سوال نطفہ قرار پاتے ہی پیدا ہو جاتا ہے۔اسے دایہ گیری کی حاجت نہیں میٹرنٹی ہوم کی ضرورت نہیں کلورافارم درکار نہیں آؤ دیکھتا ہے نہ تاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

عدالت میں مجسٹریٹ حقہ پی رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ چرکیں کا دیوان مطالعہ کر رہے ہیں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا مجرم پیش ہوتا ہے وہ مجسٹریٹ صاحب کو سلام نہیں کرتا فوراً توہین عدالت کا سوال پیدا ہو جائے گا۔

آپ کو کوئی کام نہیں مل رہا۔ دو برس تک در بدر مارے مارے پھرنے اور فاقے کھینچنے کے بعد آپ نے تنگ آ کر خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر شومئی قسمت سے ناکام رہے۔ قانونی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو کیوں اپنی جان لینے کے جرم میں سزا نہ دی جائے۔ میونسپلٹی نے دس میل لمبی ٹھنڈی سڑک بنائی اور صفائی کے پیش نظر ان دس میلوں میں کہیں بھی پبلک یورنیل نہ بنایا۔ ایک روز مثانے نے آپ کو مجبور کیا اسے ہلکا کرنے کے لیے آپ زیر دیوار بیٹھے ہی تھے کہ پولیس کے سپاہی نے دیکھ لیا۔۔۔۔۔۔ ناشائستہ حرکت کا سوال پیدا ہو گیا۔

آپ مقامی مہاجر ہیں۔ ایک پریس آپ کا راولپنڈی میں چل رہا ہے دوسرا پشاور میں، رہائش آپ کی لاہور میں ہے۔ آپ درخواست کرتے ہیں اور ایک پریس لاہور میں اپنے نام الاٹ کرا لیتے ہیں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

آپ مہاجر ہیں جہاں سے آئے ہیں وہاں ایک بہت بڑے پریس کے مالک تھے۔ لاہور میں آپ کو کوئی پریس نہیں ملتا تنگ آ کر آپ شکایت کرتے ہیں کہ فلاں مقامی مہاجر کو پریس الاٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سوال پیدا ہو جائے گا کہ مقامی مہاجر آپ سے زیادہ اہل ہے اس لیے کہ اسے دو پریس چلانے کا محاورہ ہے۔ آپ کے گھر میں ایک مہینے کے اندر اندر چھ مرتبہ چوری ہوتی ہے آپ نے اس خیال سے پولیس کو اطلاع نہیں دی تھی کہ اسے ناحق تکلیف ہو گی مگر پولیس کو پتہ چل جاتا ہے۔۔۔۔۔ یہ سوال پیدا ہو جائے گا کہ آپ نے اہم ترین فرض میں کوتاہی کیوں برتی؟ سوال بے شمار پیدا ہو چکے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ پچھلی صدی میں سب سے خوفناک سوال جو آئے دن پیدا ہوتا تھا۔ حضور **ملک معظم** کی

حکومت کا تختہ الٹنے کا تھا چنانچہ ان سو برسوں کی تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو قریب قریب ہر صفحے پر اس سوال کے پھندے میں آپ کو متعدد آدمیوں کی گردنیں پھنسی ہوئی دکھائی دیں گی۔

کسی نے ہولے سے کہہ دیا ''ہماری جہالت ہماری غربت، ہماری غلاظت کا باعث صرف غلامی ہے'' فوراً حضور **ملک** معظم کی سلطنت کا تختہ الٹنے کا سوال پیدا ہوا اور اسے تختہ دار تک لے گیا۔

امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں لوگوں نے مل جل کر آزادی طلب کرنے کے لیے جلسہ کیا۔ حضور **ملک** معظم کی سلطنت کا تختہ الٹنے کا سوال پیدا ہوا اور ہزاروں کی ہلاکت کا باعث ہو گیا۔

سوال عام طور پر خطرناک ہوتے ہیں حاکموں کے دماغ میں پیدا ہوں وہ بھی۔ محکوموں کے دماغ میں پیدا ہوں وہ بھی حکومت کے دماغ میں عام طور پر صرف ایک ہی سوال پیدا ہوتا ہے اس کی بے شمار قسمیں ہو سکتی ہیں لیکن سوال وہی رہتا ہے کہ ایسے کون سے ایکٹ استعمال کئے جائیں جن کی رو سے عوام کے ذہن میں حکومت کے متعلق پیدا شدہ سوال دب جائیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے کیا عوام کے اذہان میں حکومت کے متعلق پیدا شدہ سوال دب جاتے ہیں؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔ تجربات شاہد ہیں، تاریخ گواہ ہے کہ ایکٹ اور قوانین ایسے نتائج پیدا کرنے میں انجام کار ہمیشہ ناکام رہے کیوں؟ دیکھئے پھر سوال پیدا ہو گیا۔

ضروری نہیں کہ ہر سوال کا جواب بھی ہو۔ سوال تو یہ ہے کہ مصلحت کیا

ہے؟۔۔۔۔۔اگر مصلحت خاموشی میں ہے تو جو آدمی ذہین ہیں اور جنہیں عرف عام میں سیاست دان کہا جاتا ہے، یقیناً خاموشی ہی اختیار کریں گے مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ خاموشی دوسروں کے ذہن میں تکلم کی صورت اختیار نہیں کرے گی؟۔۔۔۔۔۔۔لیکن سوال یہ ہے کہ ان آدمیوں کا خاتمہ ہی کیوں نہ کر دیا جائے، جن کے زرخیز دماغوں میں سیاست دانوں کی خاموشی تکلم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔۔۔مگر ایک سوال پھر پیدا ہو جائے گا کہ ایسے آدمیوں کا خاتمہ جسے انگریزی کے عرف عام میں ''پرج'' یعنی جلاب، کہا جاتا ہے کیا دوسرے لوگوں کے اذہان پر بھی قابض ہو جائے گا اور ان میں اس جلاب کا کوئی بھی ردعمل پیدا نہیں ہونے دے گا۔

ایک انسان یا ایک جماعت، ایک قوم پر بہت سی قوموں پر حکومت کرتی ہے، سمجھ میں نہیں آتا۔محکوموں کے دماغ میں سوال کیوں پیدا ہو جاتے ہیں۔سیدھی سی بات ہے کہ بس اس فرد واحد یا اس جماعت کا جی چاہتا ہے کہ حکومت کرے اور حکومت کے کرنے کے لیے قواعد وضوابط بھی کون سے مقرر ہیں۔پھر ان لوگوں کے دماغ میں جن پر ان کی بہتری کے لیے حکومت کی جاتی ہے، ایسے سوال کیوں پیدا ہوتے ہیں جن سے ان کی سودمندی غلامی میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

فرانسیسی مفکر جے جے روسو کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ انسان جب آزاد پیدا ہوا ہے تو اسے کیوں زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔۔۔لیکن اس سوال کا حشر کیا ہوا؟ زنجیریں کاٹتے کاٹتے کئی انسان کٹ گئے۔۔۔۔سوال پیدا ہوتا

ہے کہ آیا ایسا انقلاب جائز ہے؟ روس میں کیا ہوا؟۔۔۔۔۔صدیوں کے غلام آزادی کا سوال لے کر اٹھے اور نتیجہ کیا ہوا۔۔۔۔۔ان کے مطلق العنان بادشاہ زار کو ایک عرصے تک سائبریا کی یخ بستہ فضاؤں میں مزدوروں کا سا کام کرنا پڑا۔۔۔آخر میں انقلابیوں نے خدا کے اس سائے کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔زار کی یہ حالت دیکھ کر شاید ہی کوئی ایسا بادشاہ ہو جس کی آنکھوں میں آنسو نہ آ جائیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ رعایا کو کیا حق ہے کہ وہ اپنے بادشاہ سلامت کو عالم پناہ کو محض ایک چھوٹا سا سوال پیدا ہونے پر قربان کر دے لیکن کیا کیا جائے۔سوال چھوٹے ہوں یا بڑے، موٹے ہوں یا پتلے، پیدا ہو ہی جاتے ہیں، بے سوچے سمجھے، انجام کا خیال کئے بغیر، تعزیر سے بے پرواہ، بس پیدا ہو جاتے ہیں۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ جو سوال دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، ان کی کاٹ دماغ ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔لیکن وہ سوال جو پیٹ کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ان کی کاٹ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی۔مثال کے طور پر ایک آدمی کے پیٹ میں بھوک کا سوال پیدا ہوتا ہے، اگر اس کے جواب میں آپ ہمدردی کا اظہار کریں، آنے والے مسرت بھرے دور کا وعدہ کریں جنت کی جھلک دکھائیں، جہاں انگور کے دانے اپنے آپ جھک کر منہ میں اپنا رس چوایا کریں گے تو ظاہر ہے آپ کی سعی بار آور ثابت نہیں ہوگی کیوں کہ پیٹ کا سوال فوری جواب مانگتا ہے۔اسے روٹی کی ضرورت ہے۔۔۔لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے پھر کیوں پیٹ کے سوال کا حل روٹی کی بجائے سوٹی سے کیا جاتا

ہے؟۔۔۔۔۔۔لیکن پھر یہ سوال بھی تو پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو دنیا میں ہر جگہ دھاندلی مچ جائے گی۔

بعض سوال تو اتنے بے ڈھب ہوتے ہیں، کچھ ایسے بینڈے پن سے پیدا ہوتے ہیں کہ آدمی سوچتا رہ جاتا ہے۔

چند روز ہوئے میں ایک سیلون میں شیو کرا رہا تھا۔ داڑھی مونڈتے مونڈتے اچانک باربر کے دماغ میں سوال پیدا ہوا ''کیوں صاحب! یہ تو بتایئے گاندھی جی خود شیو کرتے تھے یا کسی سے کراتے تھے؟۔۔۔۔'' بتایئے میں کیا جواب دیتا لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کیا میرا اعتراض بالکل فضول نہ ہوتا اگر میں اس سے کہتا ''یہ کیا اوٹ پٹانگ سوال تمہارے دماغ میں پیدا ہوا ہے؟''

آدمی نائی ہو یا موچی، یا چمار ہو یا بھنگی، لکھ پتی ہو یا کنگال اس کے دماغ میں یہ سوال ضرور پیدا ہوں گے اور اب تک ایسا کوئی طریقہ معلوم نہیں ہوا جس کے ذریعے سے ان کا برتھ کنٹرول ہو سکے۔

پرسوں بیٹھے بیٹھے نہیں کھڑے کھڑے میرے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا ''عدم جب وجود میں آیا تو کیا عدم کو کچھ تسکین ہوئی تھی؟''

بڑوں کو چھوڑیئے، بعض اوقات چھوٹے چھوٹے بچوں کے دماغ میں بھی ایسے عجیب و غریب سوال پیدا ہوتے ہیں کہ جواب دینے والا بغلیں جھانکنے والا لگتا ہے۔ مثال کے طور پر ''امی میں کہاں سے آیا ہوں'' یا۔۔۔۔۔۔۔ ''ابا کیا کبوتریاں بھی کبوتروں سے کمر دبواتی ہیں۔''

دو چھوٹے بچے تھے۔ جب انہوں نے گھر کے بند کمرے کی جھری میں سے

اندر جھانک کر دیکھا تو ان کے دماغ میں یہ گستاخ سوال پیدا ہوا ''ہمیں تو کہتے ہیں ننگے پاؤں نہ پھرو اور۔۔۔۔''

بعض اوقات ایک ہی سوال، ایک ہی وقت میں ہزار لگوں کے دماغ میں پیدا ہو جاتا ہے۔مثال کے طور پر آج کل لاکھوں کی زبان پر یہ سوال ہے کہ یہ وزارت جو مغربی پنجاب پر حکومت کرتی ہے۔وزارت ہے یا شرارت؟۔۔۔۔۔۔جو عرف عام میں جاہل ہیں۔ان کے دماغ میں بھی یہی سوال اس شکل میں پیدا ہوتا ہے ''گریبوں کی کھبر لینے والے کہاں ہیں۔۔۔'' اب ان جاہلوں سے کون کہے کہ وہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو بھی آپ اپنی خبر نہیں آتی۔

اور سنئے اسی قسم کے ایک جاہل آدمی کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا ''نواب دولتانہ۔۔۔۔۔نواب ممڈوٹ۔۔۔۔۔یہ کیا نوابی ٹھاٹ ہے؟''

ایک بچہ چند روز گزرے اپنے باپ سے پوچھ رہا تھا ''با جی ممڈوٹ اور اخروٹ میں کیا فرق ہوتا ہے؟''

سوال پیدا ہوتا ہے کیا ایسے بدتمیز بچوں کا گلا گھونٹ دینا چاہیے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایسا کرنے پر کوئی اور سوال پیدا ہو جائے گا۔

پاکستان میں آج کل مندرجہ ذیل سوالوں کی پیدائش عام ہے

1 عورت کو پردہ کرنا چاہئے یا نہیں؟

2 اگر پردہ ضروری ہے تو کیا نرسوں کو برقعہ پہن کر اپنے فرائض انجام دینے چاہئیں؟

3 عورت کی دو چوٹیاں کرنی چاہئیں یا صرف ایک؟

4 کیاعورت کا زمین پر زور سے پاؤں مار کر چلنا جائز ہے؟

5 عورت کا شلوار پہن کر گھڑ سوار کرنی چاہیے یا ساڑھی پہن کر؟

عورت ہی کے سلسلے میں ایک اور سوال پیدا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔جب ایک داڑھی والی عورت نے ایک مولوی سے پوچھا تھا میرے متعلق کیا احکام ہیں کیا مجھے داڑھی رکھنی چاہیے اگر جواب اثبات میں ہے تو فرمایا جائے کتنی لمبی۔۔۔۔۔اور مونچھوں کے متعلق کیا حکم ہے لبیں کتروانی چاہئیں یا نہیں؟

ایک سوال جو بار بار پیدا ہو کر ہمارے قائدین کو ستا رہا ہے ان پچاس ہزار عورتوں کا ہے جو اس پار رہ گئی ہیں اور دوسروں کے استعمال میں آ رہی ہیں۔نو مہینے سے کچھ اوپر ہو چکے ہیں، انہیں اس کا حل سوچتے ہوئے اور اب مصیبت یہ ہے کہ ان پچاس ہزار عورتوں کے سوال کے ساتھ ہی پچاس ہزار اور چھوٹے چھوٹے سوال پیدا ہو جائیں گے اور بہت ممکن ہے دس بیس ہزار ہو بھی چکے ہوں۔۔۔۔لعنت بھیجئے ان پر۔۔۔۔یہاں ایک اور سوال پیدا ہو رہا تھا۔

معزز خواتین و حضرات، ذلیل عوتو، ذلیل مردو۔۔۔۔۔۔۔جو سوال پیدا ہو رہا تھا، پیدا ہوتے ہی مر گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سوال مر گیا۔۔۔۔۔۔۔۔سوال زندہ باد۔۔۔۔۔۔۔۔!!

☆☆☆☆☆

کچھ ناموں کے بارے میں

بچہ پیدا ہو تو سب سے پہلے یہ استفسار کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ کس پر گیا ہے۔ تہیال پر یا ددھیال پر اس کے خدو خال چچیرے ہیں، ممیرے ہیں یا خلیرے۔ کوئی ناک بالکل باپ کی بتائے گا اور کوئی ہو بہو ماں کی اور کوئی اسے خالہ کے بھائی کے باپ کے چچا کے دادا کی ناک سے جاملائے گا۔

بعض اوقات ایسا منفرد بچہ بھی پیدا ہوتا ہے جس کے ناک نقشے کا سراغ اس کے آبا و اجداد کے شجرہ سراپا میں ڈھونڈنے پر بھی کہیں نہیں ملتا۔ لیکن بوڑھی عورتیں بھی کچھ ایسی کولمبس ہوتی ہیں کہ وہ یہ امریکہ بھی دریافت کر لیتی ہیں اور اس منفرد بچے کے ماں باپ کی الجھن دور کر دیتی ہیں۔

بچہ تو خیر مقررِ وقت کے بعد پیدا ہونا ہی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ناک نقشہ ملانے کے علاوہ اس کی پیدائش پر اور بھی کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہم یہاں ان تمام پیچیدہ مسائل کا ذکر نہیں کریں گے اس لیے کہ بچے کا نام رکھنے کا اکیلا مسئلہ ہی اس صحبت کے لیے کافی ہے۔

بچہ یا بچی جو بھی آپ کی قسمت میں تھی، پیدا ہو گئی۔ اس کا ناک نقشہ بھی کھینچ گھسیٹ کر کسی سے مل گیا لیکن ابھی چھٹی نہیں ہوئی اس لیے کہ اس دنیا میں نئے نئے آنے والے یا نئی نئی آنے والی کا نام کچھ نہ کچھ ضرور رہنا چاہیے۔ اگر آپ ڈکٹیٹر قسم کے انسان ہیں اور اپنے عزیز و اقارب کے جذبات و احساسات کو بالکل خاطر میں لانے والے نہیں تو آپ اپنے تخلیق کردہ گوشت پوست کے لوتھڑے کا

نام یوں چٹکیوں میں مقرر کر دیں گے اور آرام کی نیند سوئیں گے لیکن وہ ماں باپ جو ذرا دنیا دار قسم کے ہیں، ان کے لیے اپنے ننھے یا اپنی ننھی کا نام مقرر کرنا مستقل خلجان بن جائے گا۔

خالو جان کا ڈھاکہ سے خط آئے گا، لکھا ہو گا ''میں نے ننھے کے لیے خدا اس کی عمر دراز کرے، بڑی کاوش سے سو ناموں کی ایک فہرست بنائی ہے ان میں سے جو بھی تمہیں پسند ہو رکھ لو۔۔۔۔۔۔۔۔'' چچی جان کا راولپنڈی سے مکتوب وصول ہو گا ''ننھی کے لیے میں نے سولہ نام تجویز کئے ہیں لیکن تمہیں بھلا یہ کہاں پسند آئیں گے پھر بھی جو کچھ میں نے سوچا ہے حاضر ہے'' نانا جان اگر بقید حیات ہیں تو لب گور سے یہ خط تحریر فرمائیں گے:

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

لیکن عزیزم! مجھے اپنے غم سے نجات مل گئی۔ تمہاری گود ہری ہوئی میری ساری زندگی سرسبز ہو گئی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اتنی مدت کے بعد تمہارے نخل حیات کو بار آور فرمایا ہے اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔۔۔۔۔ میں ایک ہزار ناموں کی ایک چھوٹی سی فہرست ارسال کر رہا ہوں مجھے قوی امید ہے اس میں سے کوئی نہ کوئی تم اپنے جگر گوشے کے لیے ضرور پسند کر لو گی قبلہ دادا جان اگر کہیں پاس ہی آخری سانس لے رہے ہیں تو اسلام کی تیرہ صد سالہ روایات کی تاریخ لے کر بیٹھ جائیں گے اور اس میں سے تمام نامور آدمیوں کے نام چن چن کر والدین کے سامنے بکھیر دیں گے کہ وہ اس ڈھیر میں سے ایک اپنے آنکھ کے تارے اور راج

دلارے کے لیے منتخب کرلیں آدمی کس کی سنے اور کس کی نہ سنے۔ کس کا کہا مانے، کس کا نہ مانے کس کا دل رکھے اور کس کا واپس کردے۔۔۔۔ناموں کی فہرستوں پر غور کرتا رہے اور بچوں کے عزیزوں کے جذبات و احساسات کو بھی پیش نظر رکھے تو بہت ممکن ہے بچہ بوڑھا ہو کر اپنے والدین کے نام پر نظر ثانی شروع کر دے۔۔۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر والدین گھبرا کر جلدی میں اپنے لخت جگر کا نام مقرر کر دیتے ہیں۔

اولاد کا نام مقرر کرنے میں بعض اوقات اس گھبراہٹ، عجلت اور الجھن کے علاوہ توہم پرستی کا دخل بھی ہوتا ہے۔ اگر لڑکا یا لڑکا بہت دیر کے بعد اور بڑی منتیں ماننے کے بعد پیدا ہوا ہے تو اس کا نام بھی اسی مناسبت سے رکھا جائے گا لڑکا ہے تو مثال کے طور پر اللہ دتہ، پیراں دتہ، خدا بخش، نبی بخش، لڑکی ہے تو اللہ رکھی، پیراں دتی، خیراتن، حیاتن وغیرہ اور اگر بہت سے بچے مرنے کے بعد خدا نے لڑکا یا لڑکی دی ہے تو نام کچھ یوں ہوگا۔ اللہ جوایا، رلدو، گھسیٹا، کلن، کلوا کلب علی وغیرہ۔

انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے کتے کو کوئی برا نام دو اور اسے پھانسی پر لٹکا دو۔ لیکن چونکہ بچے کو پھانسی دینا مطلوب نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کے واسطے اچھے سے اچھا نام چننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں والدین کافی دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ قرآن سے فالیں نکالی جاتی ہیں۔ زائچے تیار کرائے جاتے ہیں، نجومیوں اور جفاروں سے رجوع کیا جاتا ہے۔ پیروں اور فقیروں کی رائے طلب کی جاتی ہے پھر جا کر بچے یا بچی کے لیے مناسب و موزوں نام ملتا ہے لیکن اولاد جونہی سن شعور کو پہنچتی ہے اپنے نام کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ والدین کے

جذبات و احساسات بالائے طاق رکھ دیئے جاتے ہیں اور اپنے نام سے بد دلی اور بے اطمینانی پیدا ہو جاتی ہے۔

ہونا یہ چاہیے تھا کہ سن شعور کو پہنچنے تک اولاد بالکل بے نام رہے۔ جوں ہی لڑکا یا لڑکی شعر یا افسانہ لکھنے کے قابل ہو جائے اس سے کہہ دیا جائے لو بھئی، اب تم جو چاہو اپنا نام رکھ لو۔ ایسا کرنے سے نہ تو والدین کا دل دکھے گا اور نہ اولاد ہی کو شکایت کا موقع ملے گا۔

مشہور ترقی پسند شاعر نذر محمد کا نام اگر ان کی طبیعت اور مزاج کے مطابق ہوتا تو ظاہر ہے کہ انہیں اس میں قطع و برید کی ضرورت کبھی لاحق نہ ہوتی۔ اگر وہ نذر محمد ہی پر طوعاً و کرہاً قائع رہتے تو آج اردو ادب یقیناً ن م راشد کی ترقی پسند شاعری سے محروم رہتا۔ شروع شروع میں یعنی قطع و برید کے فوراً بعد کچھ عرصے تک انہیں اپنے نام سے کچھ اجنبیت اور غیریت ضرور محسوس ہوتی ہو گی مگ اب وہ کچھ اس کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ اگر کوئی انہیں نذر محمد کے نام سے پکارے تو وہ سمجھیں گے کسی اور آدمی کو بلایا جا رہا ہے۔

ایک اور شاعر ہیں ماں باپ کا رکھا ہوا نام فضل دین ہے مگر اس زمانے میں جب کہ دین اور اس کے فضل کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ یہ نام کتنا بوسیدہ معلوم ہوتا ہے فضل دین کو اس کا شدید احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً اس پرانے نام کو انجم رومانی ایسے رومانٹک نام میں تبدیل کر دیا۔ سینے کا یہ بوجھ ہلکا ہوتے ہی آپ نے شاعری شروع کر دی جو بڑی ہلکی پھلکی ہے، اگر وہ اپنا نام فضل دین ہی رہنے دیتے تو ناقدین ادب یقیناً ان کے کلام کو پرانی شاعری کے مٹکے میں پھینک

دیتے۔

وقار انبالوی صاحب نے پہلے اپنا نام غاطف مولانوی رکھا چنانچہ اس نام سے ''ہمایوں'' میں ان کے اکثر مضامین چھپتے رہے لیکن جب انہوں نے غاطف مولانوی کے سامنے اپنا اصلی نام کاظم علی رکھ کر دیکھا تو یہ تبدیلی انہیں باوقار معلوم نہیں ہوئی چنانچہ انہوں نے دوسرا چولا بدلا اور وقار انبالوی ہو گئے۔

ابوالکلام آزاد پہلے معین احمد تھے۔ ساغر نظامی، صمد یار خان۔ ان کے استاد سیماب، عاشق حسین۔ حضرت جوش، شبیر حسن خان، جگر مرادآبادی، علی سکندر، سید جالب، بشارت علی اور نوح ناروی بندے حسن۔

قتیل شفائی کے ساتھ ان کے والدین نے یقیناً ظلم کیا تھا جو اورنگ زیب نام رکھ دیا۔ کہاں ترقی پسند شاعری اور کہاں رجعت پسند اورنگ زیب۔ میراجی کے نام سے کون واقف نہیں۔ آپ بھی شاعر ہیں اور ایسے ترقی پسند شاعر ہیں کہ ان کا بیشتر کلام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر رہتا ہے۔ آپ کا اصلی نام ثناء اللہ تھا۔ جس کا مطلب واضح ہے اگر آپ ثناء اللہ ہی رہتے تو آپ کو مجبوراً ایسے اشعار کہنے پڑتے جن کا مطلب واضح ہوتا لیکن ثناء اللہ کی زندگی کا مقصد چونکہ یہ نہیں تھا اور وہ پر اسرار قسم کی شاعری کرنا چاہتے تھے اس لیے انہیں اپنا نام بھی کچھ اسی قسم کا رکھنا پڑا۔

مرزا ادیب بی اے آنرز شاعر تو نہیں لیکن شاعرانہ طبیعت رکھنے والے افسانہ نویس ضرور ہیں۔ آپ کا اصلی نام دلاور علی ہے۔ نہ تو آپ دلاور ہیں اور نہ دل بدست آور چنانچہ جونہی آپ کو اپنے نام اور اپنے کردار میں بعد محسوس ہوا۔ آپ ارتقاء کی تمام منزلیں ایک ہی جست میں طے کر کے مرزا ادیب بی اے آنرز بن

گئے۔

اردو ڈرامہ نگاری کے دو نقاد بہت مشہور ہیں جن کا نام ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ چپکا رہتا ہے۔ ہماری مراد محمد عمر نورالٰہی صاحبان سے ہے۔ شوکت تھانوی صاحب کا اصلی نام محمد عمر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تھانے میں جب شوکت صاحب نے ظرافت نگاری شروع کی ہوگی تو اس لیے کہ انہیں بھی اپنے لیے ایک نورالٰہی پیدا کرنا پڑے گا خوف الٰہی کھا کر اپنا نام تبدیل کرلیا واللہ اعلم بالصواب۔

ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر میں کافی رعب ہے لیکن اصلیت کی طرف جائیں تو صرف محمد وین رہ جاتا ہے جس کے ساتھ ڈوکٹریٹ انمک بے جوڑ سی لگتی ہے۔ احمد شاہ بخاری، اے بخاری ہی کی شکل میں بھلے لگتے ہیں۔

ان کی مزاح نویسی پر احمد شاہ بالکل چسپاں نہ ہوا کیونکہ لوگوں کا خیال احمد شاہ ابدالی کی طرف چلا جاتا جسے مزاح اور ظرافت کی بجائے لوٹ مار سے دلچسپی تھی۔ بہزاد لکھنوی کی اصلیت نور محمد ہے۔ یوں تو ان کی بھوی داڑھی اور چوڑی پیشانی سے کافی نور برستا ہے لیکن ریلوے کی ملازمت کے دوران میں جب آپ کو محسوس ہوا کہ ان کی جبلت کو نور سے زیادہ رنگوں سے نسبت ہے تو آپ فوراً کایا کلپ کرا کے بہزاد لکھنوی بن گئے اور بڑے سکون اور اطمینان سے شاعری شروع کر دی خضر تمیمی صاحب اگر مولا بخش ہی رہتے تو ظاہر ہے دنیائے ادب میں ان کی وہی حیثیت ہوتی جو سکولوں میں استاد کے ڈنڈے کی ہوتی ہے۔

فلموں کے مشہور گیت لکھنے والے ڈی این مدھوک صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک بے نیاز انسان ہیں لیکن ان کو بھی اپنا اصلی نام جو کہ دینا ناتھ

ہے، پسند نہ آیا اور اسے ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی طرح فرنگی رنگ میں رنگ دیا۔

فلموں کا ذکر آیا تو لگے ہاتھوں ناموں کی شدھی کا بھی ذکر خیر وشر ہو جائے پورن بھگت بن رہا تھا۔ دیوکی بوس نے پورن کے رول کے لیے لکھنو کے ایک مسلم نوجوان علی میر عرف جمن کو منتخب کیا لیکن سوال پیدا ہوا کہ ہندو قوم معترض ہو گی۔ اتنے بڑے بھگت کا روپ ایک مسلمان نے دھارن کیا ہے۔ چنانچہ اس سوال کے پیش نظر علی میر کے نام کی شدھی کر دی گئی اور وہ اس فلم میں کمار کے نام سے پیش ہوا۔

اس کے بعد مسلمان ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو ہندوانہ نام دے کر پیش کرنے کا ایک فیشن بن گیا۔ ذکریا خان جو ٹھیٹ پٹھان ہے جینت ہو گیا اور یوسف، دلیپ کمار کشمیری نذر کی شدھی ہوئی اور وہ ''امر'' ہو گیا۔

اب ایکٹرسوں کو لیجئے تاجور (تاجور نجیب آبادی صاحب سے اس تاجور کا کوئی تعلق نہیں) وینا بن کر فلموں میں گونجنے لگی اور شاہدہ کو جب فلموں میں مشہور کیا گیا تو اس کا نام نینا تھا۔

دوغلے نام بھی رکھے گئے جن سے ہندو مسلم اتحاد کی بو آئے۔ مثال کے طور پر ممتاز شانتی، گیتا نظامی وغیرہ وغیرہ، ایک ایکٹریس کا نام ہے آشا پوسلے، سمجھا کرے کوئی، ناموں کے معاملے میں سکھ حضرات دوسروں کے مقابلے میں بہت ثابت قدم واقع ہوئے ہیں۔ سردار کھڑک سنگھ اتنے برس گزر گئے ہیں انہیں کھڑکتے ہوئے لیکن مرحبا ہے کہ ابھی تک ان کے دل میں کھڑکھڑاتا نام تبدیل ہونے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔

تقسیم ہندوستان سے پہلے لاہور میں ایک ودھاوا سنگھ تھے آپ کو اس بیڈھب نام سے بالکل نفرت پیدا نہ ہوئی اور جب تک یہاں دکان رہی، برابر ''بھائی ودھاوا سنگھ کے اچار شلجم'' کا اشتہار دیتے رہے۔

سکھوں میں کئی لاہور سنگھ ہیں، پشاورا سنگھ ہیں، پہاوڑا سنگھ ہیں، ہتھوڑا سنگھ ہیں، ہمارا خیال ہے ان میں سے اگر کوئی ترقی پسند شاعر ہی کیوں نہ بن جائے تو بھی وہ اپنا نام تبدیل نہیں کرے گا۔

سر جائے تے بھاویں جائے میری سکھی صدق نہ جائے

سکھوں کی جرأت رندانہ کی داد دینی پڑتی ہے ورنہ ایمان کی بات ہے کون پہاوڑا سنگھ جیسے بھاری بھرکم نام کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکتا ہے۔

ہلکے پھلکے اور خوبصورت نام رکھنے میں گانے اور مجرا کرنے والیاں پیش پیش ہیں، شمشاد ہے، صنوبر ہے، گلاب ہے، نیلم ہے، الماس ہے، انوری ہے، مشتری ہے، زہرہ ہے اور یہ نام کچھ اس طرح اس خاص طبقے سے منسوب کئے ہوئے ہیں کہ دوسروں کے لیے شجر ممنوعہ بن گئے ہیں۔

گانے والیوں میں بوا بائی، چھوئی موئی بائی اور طمنچہ جان ایسے عجیب وغریب نام بھی موجود ہیں آخر الذکر کو ترقی پسندی کی آخری حد تک جا پہنچا ہے مگر صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔۔۔۔۔۔آج کل دوسری اجناس کی طرح ناموں کا بھی قحط ہے۔ نئے نام تلاش بسیار کے بعد بھی دستیاب نہیں ہوتے۔ ہمارا خیال ہے طمنچہ جان نے نئے ناموں کا ایک بالکل ہی نیا رستہ کھول دیا ہے۔ بڑی آسانی سے ایسے مسلح نام وضع کئے جا سکتے ہیں۔

توپ کماری، اینٹی ایر کرافٹ بیگم، ایٹم الدین، ٹینک سنگھ، بندوق بانو، گولہ بخش، مشین گن داس، بل ڈوزر خان، سنگین خاتون، مائن کور، تھری نوٹ تھری چند، ہینڈ گرینیڈ دیوی، مورٹر مل، بومبر بائی، دی ون جان، دی ٹو بوس وغیرہ وغیرہ۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

میں فلم کیوں نہیں دیکھتا

بہت دنوں سے میری خواہش تھی۔ کوئی مجھ سے سوال کرے کہ میں فلم کیوں نہیں دیکھتا۔ گھر میں کئی دفعہ مجھ سے پوچھا گیا کہ ''میں بھنڈی کیوں نہیں کھاتا'' یار دوستوں نے متعدد بار دریافت کیا ''میں پتلون کیوں نہیں پہنتا'' گھر اور گھر کے باہر یہ استفسار بھی کئی مرتبہ ہوا کہ ''میں بال کیوں نہیں کٹواتا'' پر مجھ سے میری خواہش کے مطابق یہ کسی نے پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ''میں فلم کیوں نہیں دیکھتا؟'' ۔۔۔۔ حالانکہ مجھے جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ فلم ایک زمانہ ہوا، مجھے بے حد مرغوب تھے۔ ایک ایک دن میں تین تین فلم دیکھتا اور جو پسند آ جائے اسے بار بار دیکھتا تھا۔ امرتسر سے لاہور اور جالندھر جا جا کے دیکھتا تھا اور مجھے یاد ہے ایک فلم کے لیے جس میں میری پسندیدہ ہیروئن کام کر رہی تھی۔ مجھے دہلی تک کا سفر اختیار کرنا پڑا لیکن ایسا کیا ہوا جو میں نے فلم دیکھنے بند کر دیئے۔

بہت دنوں کے بعد یہ مجھے آج موقعہ ملا کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دوں ورنہ جب بھی فلم دیکھنے کی دعوت پر میں نے کسی دوست سے کہا ''میں فلم نہیں دیکھا کرتا'' اور متوقع رہا کہ وہ مجھ سے پوچھے گا، آخر کیوں؟ مجھے ہمیشہ ناامیدی ہوئی کسی نے کھٹ سے موٹر کا دروازہ بند کیا اور اچھا کہہ کر یہ جا وہ جا۔ کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی اور میں نے بجائے ''آخر کیوں؟'' کے یہ سنا ''تم عجیب و غریب آدمی ہو'' اور کسی نے بالکل بنیوں کی طرح کہا ''اچھا ہے، میرے پیسے بچ گئے۔''

کوئی زمانہ تھا کہ ایڈی پولو سے لے جون گلبرٹ اور میری پکفورڈ سے لے کر گلوریا سونسن تک مجھے تمام ایکٹرا یکٹرسوں کے نام، ان کے پتے اور ان کی عمریں یاد تھی۔ للین گش اور اس کی بہن ڈورتھی کش کے قد کی لمبائی تو مجھے ابھیت ک یاد ہے لیکن آج مجھ سے کوئی پال روبسن کی بات کرے تو میرا دھیان روبنسن کروسو کی طرف چلا جاتا ہے اور جنجر کا ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے دوست احباب شانتا وین، شانتا ہلی کر اور شانتا موزمدار کی کردار نگاری پر بحث شروع کرتے ہیں تو میں چلا دیتا ہوں ''شانتی! شانتی'' پری چہرہ نسیم بانو، حور تمثال وینا، آہو چشم راگنی، کافر ادا ثریا اور مرمریں جسم شمیم سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں آپ سوچیں گے شاید میں دنیا تیاگ کے سنیاسی بن گیا ہوں، بدن پر بھبھوت مل کے میں نے کسی پہاڑ کی چوٹی پر آسن جما لیا ہے۔۔۔۔جی نہیں، میں ابھی تک آپ ہی کی دنیائے رنگ و بو میں سانس لے رہا ہوں کل کا بھروسہ نہیں۔ ابھی تک کھاتا ہوں، پیتا ہوں، سوتا ہوں، جاگتا ہوں، اچھے افسانے پڑھ کر داد دیتا ہوں، موزوں شعر سن کر پھڑک بھی جاتا ہوں لیکن صاحب میں فلم نہیں دیکھتا۔

کوئی زمانہ تھا، میرے کمرے کی زینت صرف ایکٹر اور ایکٹرسوں کی تصویریں ہوا کرتی تھیں۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ ان تصویروں کے فریم میں خود اپنے ہاتھ سے بنایا کرتا تھا لیکن آج میرے کمرے میں آپ کو صرف ڈاسن کے کارٹون آویزاں نظر آئیں گے جو بندوں کے نفسیات کی تصویر کشی کا ماہر ہے۔۔۔۔آپ سوچئے اتنا بڑا انقلاب کیسے برپا ہوا؟

میرے دل و دماغ میں بہت ہی خوبصورت صنم خانہ تھا جس میں ہر شام اپنے

پسندیدہ ایکٹروں کی آرتی اتارنے میں مجھے روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی مگر ایسا کیا ہوا جو میں نے عقیدت کے سب چراغ بجھا دیئے۔ سارے پھول پاؤں تلے روند ڈالے۔۔۔ کیا مجھ میں غزنوی کی روح حلول کر گئی تھی؟۔۔۔۔۔۔۔جی نہیں، میری داستان بالکل مختلف ہے بعض لوگ فلم اس لیے نہیں دیکھتے کہ آشوب چشم میں مبتلا ہیں، بعض اس لیے کہ فلم شروع ہوتے ہی ہال میں سو جاتے ہیں، کچھ اس لیے کہ رقیق القلب ہیں، پردے پر کھلم کھلا عشق لڑتا دیکھ کر ان پر دل کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو شیطانی کھیل سمجھ کر ان سے دور رہتے ہیں لیکن میں کیوں ان سے احتراز کرتا ہوں۔۔۔۔۔میری بینائی کمزور ہے لیکن چشمہ اس کی تلافی کے لیے میری ناک پر ہر وقت موجود رہتا ہے میرا دل چشم بد دور کافی مضبوط ہے۔ ثبوت کے لیے ڈاکٹر کا لیا ہوا کارڈیوگرام موجود ہے۔ میں فلموں کو انسانوں کا کھیل سمجھتا ہوں پھر مجھ کیا ہے کہ فلم نہیں دیکھتا۔

میں فلم نہیں دیکھتا یہ سن کر ان لوگوں کو تو اور بھی زیادہ حیرت ہوگی۔ جو مجھے فلم نویس کی حیثیت سے جانتے ہیں سوچتے ہوں گے یہ کیسا شخص ہے، فلم کے لیے کہانیاں لکھتا ہے، مکالمے لکھتا ہے، ایک فلم میں قریب قریب ایکٹ بھی کر چکا ہے، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو لگ بھگ دس برس سے اس صنعت میں جھک مار رہا ہے اور کہتا ہے میں فلم نہیں دیکھتا۔۔۔۔۔صریحاً بن رہا ہے۔

صاحب حاشا و کلا، میں بن نہیں رہا، روز محشر میرا گریبان کسی بھی ایکٹریس کے ہاتھ میں ہو جو میں آپ کے سامنے بناوٹ سے کام لوں۔۔۔۔۔۔ لیجئے میں آپ سے سچ سچ عرض کرتا ہوں۔۔۔۔بناوٹ اور صرف بناوٹ نے میرا دل کھٹا

کیا۔ مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو یہی وجہ ہے کہ میں آج بالکل فلم نہیں دیکھتا۔

آج سے بارہ برس پہلے کی بات ہے میں نے بمبئی کے فلمی سومنات پر چار حملے کیے۔ آخری حملہ زندگی کی تاریخ میں بہت مشہور اور اہم ہے کیونکہ میں ایک اسٹوڈیو کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔۔۔۔خوف ناک پٹھان پہرے دار کی نظر بچا کر جونہی میں پھاٹک کے اندر گھسا، چاروں طرف سے ''آدم بو، آدم بو!'' کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک کالی عورت پاس سے گزری تو میں نے دل میں دعا مانگی کہ وہ مجھ پر عاشق ہو جائے اور الف لیلیٰ کی ہیروئنوں کی طرح کوئی افسوں پھونک کر مجھے مکھی بنا دے تا کہ میں آنے والی آفت سے محفوظ ہو جاؤں مگر وہ کولہے مٹکاتی چلی گئی۔ اتنے میں ایک شور برپا ہوا اور میں نے دیکھا کہ بتہ سے آدمی زدہ بکتر پہنے ہاتھ میں ننگی تلواریں لیے ایک کونے سے نمودار ہوئے اور ناچتے پھدکتے ایک بہت بڑے اصطبل میں داخل ہو گئے۔۔۔۔۔۔ان میں سے ایک کی تلوار ہاتھ سے گر پڑی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اٹھانا چاہی تو میرا ہاتھ ہوا ہی میں تل کر رہ گیا۔۔۔۔۔۔۔تلوار لکڑی کی طرح تھی۔

انگوٹھے پر لب لگا کر میں ابھی اس تلوار کی دھار ہی دیکھ رہا تھا کہ سامنے سے ایک بڑی بڑی مونچھوں والا قوی ہیکل دیو نمودار ہوا۔۔۔۔۔۔یہ پھاٹک کی طرف جانے ہی والا تھا کہ ایک آواز بلند ہوئی ''اے کمپنی کا مال لئے کدھر جاتا ہے؟''

مونچھوں والا دیو کانپ گیا اور لرزاں آواز میں بولا ''کیا ہے سیٹھ؟''

سیٹھ نے جسے میں راجہ اندر سمجھا تھا، بارعب آواز میں پوچھا۔ یہ مونچھ کس کا

ہے؟ مونچھوں والے نے اپنی مونچھوں کو مروڑا دے کر بڑے عجز سے کہا ''سیٹھ یہ تو میری اپنی ہے۔''

سیٹھ صاحب کا اطمینان ہوا چنانچہ انہوں نے حکم دیا ''اب تم جانے کو سکتا ہے۔''

دیو جانے کو سک گیا یعنی چلا گیا تو سیٹھ صاحب نے مجھے پکڑ کر ملازم رکھ لیا اور دوسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ میرا نام سعادت حسن منٹو نہیں صرف منشی ہے اور میرا کام یہ ہے کہ فلم ڈائریکٹر کے لیے ہر پانچ منٹ کے بعد بازار سے پان لاؤں اور چونہ کروں۔ جب اس سے فراغت ہو تو ان کی خواہش کے مطابق غلط سلط اردو میں ڈائیلاگ لکھ دیا کروں اور ٹوں نہ کروں۔

ان دنوں میری بھی زبان سے کوئی اتنی دوستی نہیں تھی اس لیے ڈائریکٹر صاحب کے ساتھ مل کر ہر روز اس کی ٹانگ توڑتے وقت میرے جذبات مجروح نہیں ہوتے تھے لیکن صاحب ایک روز معاملہ بہت ہی سنگین ہو گیا۔ جب سیٹھ صاحب نے ڈائریکٹر صاحب کے ساتھ ہاتھ ملایا اور یہ خوش خبری سنائی ''دادا تیرھویں فلم کے رائٹس آج میں نے بیچ دیئے ہیں'' ڈائریکٹر صاحب نے مبارک باد دی اور سیٹھ سے پوچھا ''نام کیا رکھا ہے؟'' سیٹھ صاحب مسکرائے ''ایک دم فائن ہے پھرج ادا'' ڈائریکٹر صاحب میری طرف متوجہ ہوئے اور نام کی تصحیح کرتے ہوئے کہا ''منشی صاحب! آج سے ''فرج ادا'' کی کہانی لکھنی شروع کر دیجئے لیکن پہلے میرے لیے ایک دیسی کالا کانڈی۔۔۔۔۔۔۔۔''

میں نے قطع کلامی کی اور کہا ''دیسی کالا کانڈی، سینکی لی، سوپاری، انگلی پر چونا

اور ایک پاسنگ سوپ سگریٹ ۔۔۔۔۔یہ میں سب ابھی حاضر کئے دیتا ہوں، لیکن یہ ''فرض ادا'' کی ترکیب بالکل غلط ہے۔''

سیٹھ صاحب نے غصے سے پوچھا ''کیا بولا؟''

میں بولا ''میں یہ بولا کہ جو کچھ آپ بولے ہیں، ہماری بولی میں چلنے کو نہیں سکے گا۔''

ڈائریکٹر صاحب بولے ''کیسے چلنے کو نہیں سکے گا''

میں بولا ''ایسے چلنے کو نہیں سکے گا کہ یہ ایک دم رونگ ہے۔ادائیگی فرض ہوسکتا ہے فرض ادائیگی کہہ لیجئے زیادہ سے زیادہ ادائے فرض کہہ لیجئے کہ اس کا مطلب بھی وقت آنے پر نکال لیا جا سکتا ہے لیکن از برائے خدا ''فرض ادا'' ٹائیٹل فوراً چینج کر دیجئے''

سیٹھ صاحب نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا ''تمہارا بھیجا پھرے لا ہے منسی ٹائیٹل چینج ہونے کو نہیں سکتا۔اس واسطے کہ ہم فلم بیچ چکا ہے'' یہ سن کر میرا بھیجا یعنی دماغ پھر گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ میں کمپنی کے باہر تھا۔

دوسری کمپنی سے باہر نکلنے کی داستان بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔تازہ فلم کا نام ''الو کے دو پٹھے'' تجویز ہوا۔میں نے اعتراض کیا اور ''الو کے دو پٹھے'' کیا ہوا ''دو الو کے پٹھے'' ہونا چاہیے جواب ملا ''تم کون ہوتے ہو مال پانی ہمارا خرچ ہو رہا ہے، ہم چاہے گا تو پٹھے کے دو الو بھی چلے گا'' چنانچہ ''الو کے دو پٹھے'' کی شوٹنگ شروع ہوگئی اور میں کمپنی کے باہر تھا۔

فلموں سے اب میرا دل ٹوٹنا اور کھٹا ہونا شروع ہوا اور چند برسوں ہی میں چور

چوراور رتش ہو کر بالکل اچور بن گیا۔

چھوٹی موٹی فلم کمپنیوں میں دربدر ہونے کے بعد آخر کار مجھے ایک ایسے فلمی ادارے میں جگہ مل گئی۔ جس کا بہت نام تھا اور جس کے بنائے ہوئے فلم بہت صاف ستھرے ہوتے تھے۔ اس فلمی ادارے کی چاردیواری میں چار برس میں نے فلم نویسی کی، آہستہ آہستہ میں نے اپنے ذوق فلم بینی کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔

تجہیز و تکفین کی داستان بہت لمبی ہے اور مجھے صرف چند کالموں میں اختصار کے ساتھ متعدد باتیں بیان کرنا ہیں۔

ایک ایکٹریس کی شہہ سواری کا بہت شہرہ تھا لیکن جب گھوڑے پر سوار ہونے کا وقت آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک لکڑی کا گھوڑا اسیٹ پر لایا جا رہا ہے۔ یہ گھوڑا بھی پورا نہیں تھا۔ صرف پیٹھ ہی پیٹھ تھی جس پر کاٹھی ٹکی ہوئی تھی۔ تھوتھنی اور دم بالکل گدھے کے سینگ۔۔۔ ایکٹریس صاحبہ کو تین آدمیوں نے سہارا دے کر اس شے عجیب پر سوار کیا۔

لائٹ اون ہوئی ڈائریکٹر صاحب نے حکم دیا ''گو'' ایک آدمی نے جلدی سے ایکٹریس صاحب کے ہاتھ میں لگامیں تھمائیں اور دوسرے نے ہولے ہولے لکڑی کے اس نامکمل گھوڑے کو ہلانا شروع کیا دیر تک یہ سلسلہ جنبانی فلمائی جاتی رہی۔ دوسرے روز آوٹ ڈور شوٹنگ ہوئی۔ سرکس کے ایک ماہر گھڑسوار کر اس ایکٹریس کی ساڑھی بلاوز پہنایا گیا اور ایسے گھوڑے پر جو پٹھے پر ہاتھ دھرنے نہیں دیتا تھا اور بار بار الف ہو جاتا تھا۔ سوار کرا کے اس کے مختلف کرتب فلمائے گئے۔۔۔ یہ سب ٹکڑے جڑ کر جب پردے پر آئے تو میری حیرت زدہ آنکھوں

نے دیکھا کہ وہ ایکٹریس ہی سب کچھ کر رہی ہے۔

ہیروئن کے ہاتھ کا کلوز اپ لینا تھا۔ لوگوں کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ اس کے ہاتھ بہت ہی خوب صورت ہیں مگر اس ''پری پیکر'' کی انگلیاں بہت ہی بدنما تھیں ٹیڑھی میڑھی ڈائریکٹر صاحب کو فوراً سوجھی جھٹ سے دس بارہ ایکسٹرا لڑکیاں منگوائیں۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ اچھے تھے چنانچہ ایک دم ان پر سفیدی اور سرخی مل کر کلوز اپ لے لیا گیا اور اس پری پیکر کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ اس وقت چچا غالب یاد آ گئے۔

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

دکھانا تھا کہ بہت زوروں کا جھکڑ چلا رہا ہے اور خطرناک قسم کا مینہ برس رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ مچان پر کئی آدمی پھولوں کو پانی دینے والے بھپاروں میں پانی بھر بھر چھوڑ رہے ہیں۔ ایک طرف ہوائی جہاز کا پنکھا موٹر کے ذریعے سے چل رہا ہے۔ پاس ہی دو آدمی پتوں اور ٹہنیوں کی ٹوکریاں اٹھائے کھڑے ہیں اور مٹھیاں بھر بھر کے یہ پتے اور ٹہنیاں پنکھے کے منہ پر مار رہے ہیں۔ سامنے کپڑے کا آسمان تنا ہے ایک آدمی کبھی سوئن اون کرتا ہے اور کبھی اوف، دوسرا ٹین کی ایک بہت بڑی چادر کھڑکھڑا رہا ہے۔ پردے پر یہ منظر دیکھا تو عقل کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ منوں پانی برس رہا تھا، درخت تیز آندھی کے مقابلے میں جھکے جا رہے تھے، ٹہنیاں چیخ رہی تھیں، خوف ناک قسم کی بجلی چمک اور کڑک رہی تھی اور ہیرو اس طوفان میں کھڑا اپنی کشتی مردانہ وار کھے رہا تھا۔

کڑا ہے میں دودھ ابل رہا ہے لیکن اصل میں دیواروں پر پھیرنے والی سفیدی

ہے۔

وادی کشمیر میں برف باری ہو رہی ہے لیکن بہت سے مزدور کاغذ کے بنے ہوئے سردوں پر اوپر سے صابن کی ہوائیاں اور کاغذ کے ننھے ننھے ٹکڑے منتشر کر رہے ہیں۔

بڑے حسین قسم کا کہر چھایا ہوا ہے جس میں ملفوف ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کے ساتھ لگے محبت بھری باتیں کر رہے ہیں لیکن سیٹ پر دونوں کا سانس سوکھی گھاس کے دھوئیں میں گھٹ رہا تھا۔

ابھی ابھی ہیروئن ہیرو کے ساتھ سیٹ پر ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی۔ شوٹنگ شروع ہوئی تو میک اپ مین نے ڈروپر سے اس کی آنکھوں میں گلیسرین کے چند قطرے ڈال دیئے اور لو صاحب، آنسوؤں کے موتی ڈھلکنے لگے۔

گا کوئی رہا ہے، لب کسی کے ہل رہے ہیں۔ لکڑی کا ٹیلی فون میز پر دھرا ہے پاس ہی ایک آدمی گھنٹی لیے کھڑا ہے۔ وہ بجاتا ہے تو ہیرو صاحب جھٹ سے ریسیور اٹھاتے ہیں جیسے سچ مچ کال آئی ہے۔ ہیروئن گیسو بریدہ ہے لیکن پردے پر دیکھو تو کسی زلف دراز تیل کا اشتہار دکھائی دیتی ہے۔ گھونسا چلتا ہے، لگتا لگاتا کسی کے بھی نہیں لیکن دو تین آدمی چت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میز پر پھلوں کے انبار لگے ہیں لیکن ان میں صرف ایک کیلا اصلی ہے جو ہیرو کے والد بزرگوار کو کھانا ہے باقی سب مٹی کے ہیں، چلچلاتی دھوپ ہے لیکن کیمرے پر ریڈ فلٹر لگا یا اور لیجئے دھوپ ٹھنڈی چاندنی میں تبدیل ہو گئی۔ زیبرا نہیں ملتا تو گدھے ہی پر سیاہ و سفید دھاریاں کھینچیں اور زیبرا بنا دیا۔

میدے کی چٹکی پھانک کر آدمی مر رہا ہے اور لوگ واویلا کر رہے ہیں۔ آدمی اوپر سے نیچے گر رہا ہے کیمرہ الٹھا گھما دیا۔ پردے پر وہ اچک کر اوپر جاتا دکھائی دے گا جیسے اس کے اسپرنگ لگے تھے۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھے گا۔

یقین مانئے یہ بناوٹیں دیکھ دیکھ کر میرا دل کھٹا ہو گیا اور انگریزی ضرب المثل کے اونٹ کی کمر اس آخر تنکے نے توڑ دی۔ جب میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے بنے ہوئے فلم کو ہال میں تماشائیوں کے ساتھ دیکھا اور ہیروئن کی مصنوعی پلکوں سے پھسلتے ہوئے گلیسرینی آنسوؤں نے مجھے ایک سے زیادہ بار رلایا۔

کتنا بڑا فریب ہے یہ فلم کہ خود فریب ساز بھی فریب کھا جاتے ہیں۔ خدا اب مجھے وہ دن نہ دکھائے کہ میں فلم دیکھوں۔

☆☆☆☆☆

سویرے جو آنکھ میری کھلی

عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی یہی جی میں آئی کہ گھر سے نکل ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ چل۔ باغ پہنچنے سے پہلے ظاہر ہے کہ میں نے کچھ بازار اور کچھ گلیاں طے کی ہوں گی اور میری آنکھوں نے کچھ دیکھا بھی ہوگا۔ پاکستان تو پہلے ہی کا دیکھا بھالا تھا پر جب سے زندہ باد ہوا وہ کل دیکھا، بجلی کے کھمبے پر دیکھا، پرنالے پر دیکھا، شہ نشیں پر دیکھا، چھجے پر دیکھا، چوبارے پر دیکھا، غرضیکہ ہر جگہ دیکھا اور جہاں نہ دیکھا وہاں دیکھنے کی حسرت لیے گھر لوٹا۔

پاکستان زندہ باد یہ لکڑیوں کی ٹال ہے پاکستان زندہ باد، فٹافٹ مہاجر ہیر کٹنگ سیلون پاکستان زندہ باد یہاں تالے مرمت کئے جاتے ہیں۔ پاکستان زندہ باد، گرما گرم چائے پاکستان زندہ باد، بیمار کپڑوں کا ہسپتال۔۔۔۔۔۔ پاکستان زندہ باد، الحمدللہ کہ یہ دکان سید انور حسین مہاجر جالندھری کے نام الاٹ ہوگئی ہے۔

ایک مکان کے باہر یہ بھی لکھا ہوا دیکھا پاکستان زندہ باد۔۔۔۔۔۔ یہ گھر ایک پارسی بھائی کا ہے۔۔۔۔۔ یعنی حضرت کہیں اسے بھی نہ الاٹ کرا لیجئے گا۔

صبح کا وقت تھا۔ عجب بہار تھی اور عجب سیر تھی قریب قریب ساری دکانیں بند تھیں ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی میں نے کہا چلو لسی ہی پیتے ہیں دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں بجلی کا پنکھا چل تو رہا ہے لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے میں نے حلوائی سے کہا ''یہ الٹے رخ پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟۔۔۔۔۔۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا'' دیکھتے نہیں ہو'' ۔۔۔۔۔ میں نے

دیکھا۔۔۔۔۔ پنکھے کا رخ قائد اعظم محمد علی جناح کی رنگین تصویر کی طرف تھا جو دیوار کے ساتھ آویزاں تھی۔۔۔۔ میں نے زور کا نعرہ لگایا ''پاکستان زندہ باد'' اور لسی پیئے بغیر آگے چل دیا۔''

بند دکان کے تھڑے پر ایک آدمی بیٹھا پوریاں تل رہا تھا۔ میں سوچنے لگا ابھی پرسوں میں نے اس دکان سے چپل خریدے تھے۔ یہ پوری والا کدھر سے آ گیا۔ خیال آیا شاید کوئی دوسری دکان ہو لیکن بورڈ وہی تھا سامنے وہی فسادات میں جھلسا ہوا مکان تھا جس کی برساتی میں بجلی کا پنکھا لٹک رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا آگ جلانے میں اس نے بھی کافی مدد دی ہوگی۔ پوری والے نے مجھے مخاطب کیا اور کہا ''کیا سوچ رہے ہیں آپ بابو جی گرما گرم پوریاں ہیں'' میں نے کہا ''بھئی میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جہاں تم بیٹھے ہو، یہاں جوتوں کی دکان ہوا کرتی تھی'' پوری والا اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر مسکرایا ''جوتوں کی دکان اب بھی ہے لیکن وہ نو بجے شروع ہوتی ہے اور میری صبح چھ بجے سے شروع ہوتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جاتی ہے۔''

میں آگے بڑھ گیا۔

کیا دیکھتا ہوں ایک آدمی سڑک پر کانچ کے ٹکڑے بکھیر رہا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ بھلا آدمی ہے اس بات کا احساس رکھتا ہے کہ لوگوں کو تکلیف دیں گے اس لیے سڑک پر سے چن رہا ہے لیکن جب میں نے دیکھا کہ چننے کی بجائے وہ بڑی ترتیب سے انہیں ادھر ادھر گرا رہا ہے تو میں کچھ دور کھڑا ہو گیا۔

جھولی خالی کرنے کے بعد وہ سڑک کے کنارے بچھے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھ گیا۔

پاس ہی ایک درخت تھا۔ اس پر ایک بورڈ لگا تھا ''یہاں سائیکلوں کے پنکچر لگائے جاتے ہیں اور ان کی مرمت کی جاتی ہے''

میں نے قدم تیز کر دیئے۔

دکانوں کے سائن بورڈوں میں ایک خوشگوار تبدیلی نظر آئی پہلے قریب قریب سب انگریزی میں ہوتے تھے۔ اب کچھ دکانوں پر نام اور تحریر دونوں اردو لباس میں نظر آئے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے جیسا دیس ویسا بھیس

تحریر خوش خط تھی اور نام بھی جاذب نظر تھے۔ مثال کے طور پر ''آرائش'' ظاہر ہے کہ دکان میں آرائش سے متعلقہ سامان ہو گا ایک ہوٹل کھلا تھا اس کی پیشانی پر عربی رسم الخط میں ''ماحضر'' لکھا تھا۔ آگے چل کر ایک دکان تھی جس کا نام ''پاپوشیانہ'' تھا یعنی جوتوں کا آشیانہ ایک دکان کی پیشانی پر یہ بورڈ آویزاں تھا ''زمہریر'' ضرورقلفیوں کی دکان تھی

میں نے خوش ہو کر ''پاکستان زندہ باد'' کہا اور چلتا رہا۔

چلتے چلتے سائیکل کے چار پہیوں پر ایک عجیب وضع کی ہاتھ گاڑی دیکھی پوچھا ''یہ کیا ہے؟'' جواب ملا ''ہوٹل'' ۔۔۔۔۔ چلتے پھرتا ہوٹل تھا۔ چپاتیاں پکانے کے لیے انگیٹھی اور توا موجود۔ چار سالن تیار شامی کباب تلنے کے لیے فرائی پین حاضر، پانی کے دو گھڑے، برف لیمونیڈ کی بوتلیں، دہی کا کونڈا۔ لیموں نچوڑنے کا کھٹکا۔ گلاس پلیٹیں غرضیکہ ہر چیز موجود تھی۔

کچھ دور آگے بڑھا تو دیکھا، ایک آدمی چھوٹے سے لڑکے کو دھڑا دھڑ پیٹ رہا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا لڑکا نوکر ہے اور اس نے ایک روپے کا

نوٹ گما دیا ہے میں نے اس ظالم کو جھڑکا اور کہا ''کیا ہوا بچہ ہے، کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ ہی ہوتا ہے، ایک روپے کا نوٹ۔ کہیں گر پڑا ہوگا خبردار جو تم نے اس پر ہاتھ اٹھایا۔''

یہ سن کر وہ آدمی مجھ سے الجھ گیا اور کہنے لگا ''تمہارے نزدیک ایک روپے کا نوٹ کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ ہے لیکن جانتے ہو کتنی محنت کے بعد یہ کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ ملتا ہے، آج کل'' ۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر وہ پھر اس بچے کو پیٹنے لگا۔ مجھے بہت ترس آیا جیب سے ایک روپیہ نکالا اور اس آدمی کو دے کر بچے کی جان چھڑائی۔ چند قدموں ہی کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک آدمی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر کہا ''روپیہ دے دیا آپ نے اس خبیث کو؟''

میں نے جواب دیا ''جی ہاں! بہت بری طرح پیٹ رہا تھا بے چارے کو''

''بے چارہ اس کا اپنا لڑکا ہے''

''کیا کہا؟''

''باپ اور بیٹے دونوں کا یہی کاروبار ہے دو چار روپے روزانہ اسی ڈھونگ سے پیدا کر لیتے ہیں۔''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے'' اور قدم آگے بڑھا دیئے۔

ایک دم شور سا برپا ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں کاغذ کے بنڈل لئے چلا رہے ہیں اور اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں۔ اخبار بک رہے ہیں، تازہ تازہ اور گرما گرم خبریں۔۔۔۔۔۔ دہلی میں جوتا چل گیا۔۔۔۔ لکھنو میں فلاں لیڈر کی کوٹھی پر

کتوں نے حملہ کر دیا۔۔۔۔۔پاکستان کے ایک نجومی کی پیش گوئی کشمیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔

سینکڑوں ہی اخبار تھے۔آج کا تازہ ''نوائے صبح''۔۔۔۔۔آج کا تازہ ''ابو الوقت''۔۔آج کا تازہ ''سنہرا پاکستان''

اخبار فروش لڑکوں کا سیلاب گزر گیا تو ایک عورت نظر آئی۔عمر یہی کوئی پچاس کے لگ بھگ سنجیدہ اور متین صورت ایک ہاتھ میں تھیلا تھا دوسرے میں اخباروں کا بنڈل میں نے پوچھا ''کیا آپ اخبار بیچتی ہیں''مختصر جواب ملا''جی ہاں''

میں نے دو اخبار خریدے اور دل میں اس اخبار فروش خاتون کا احترام لیے آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں کتوں کا ایک غول نمودار ہوا بھونک رہے تھے ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ پیار کر رہے تھے اور کاٹ بھی رہے تھے۔ میں ڈر کے ایک طرف ہٹ گیا کیونکہ پندرہ روز ہوئے ایک کتے نے مجھے کاٹ کھایا تھا اور پورے چودہ دن، دس سی سی کے ٹیکے مجھے اپنے پیٹ میں بھنکوانے پڑے تھے۔

میں نے سوچا کیا یہ سب کتے پناہ گیر ہیں یا وہ ہیں جو یہاں سے جانے والے اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں کوئی بھی ہوں، ان کا خیال تو رکھنا چاہیے جو پناہ گیر ہیں۔ ان کو پھر سے آباد کیا جائے اور جو بے آقا ہو گئے ہیں۔ان کو ان کی نسل کے اعتبار سے ان لوگوں کے نام الاٹ کر دیا جائے۔جن کے کتے اس پار رہ گئے ہیں اور جن کا کوئی والی وارث نہیں ان کے لیے لکڑی کی ٹانگیں مہیا کی جائیں تا کہ وہ ان ہی سے اپنا شغل پورا کرتے ہیں۔

کتوں کا غول چلا گیا تو میری جان میں جان آئی میں نے قدم بڑھانے شروع کیے میں نے ایک اخبار کھولا اور اسے دیکھنا شروع کیا سرورق پر ایک فلم ایکٹریس کی تصویر تھی، تین رنگوں میں، ایکٹریس کا جسم نیم عریاں تھا، نیچے یہ عبارت تھی۔

''فلموں میں بے حیائی کا مظاہرہ کیسے کیا جاتا ہے اس کا کچھ اندازہ اس تصویر سے ہوسکتا ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ لگایا اور اخبار کو فٹ پاتھ پر پھینک دیا دوسرا اخبار کھولا ایک چھوٹے سے اشتہار پر نظر پڑی مضمون یہ تھا

''میں نے کل اپنی سائیکل لائیڈز بینک کے باہر رکھی۔ کام سے فارغ ہو کر جب لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سائیکل پر پرانی گدی کسی ہوئی لیکن نئی غائب ہے۔ میں غریب مہاجر ہوں جس صاحب نے لی ہو، براہ کرم مجھے واپس کر دیں۔''

میں خوب ہنسا اور اخبار تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

چند گزوں کے فاصلے پر ایک جلی ہوئی دکان دکھائی دی اس کے اندر ایک برف کی دو موٹی موٹی سلیں رکھے بیٹھا تھا میں نے دل میں کہا ''اس دکان کو آخر کار کسی طرف سے ٹھنڈک پہنچ ہی گئی۔''

دو تین سائیکلیں دیکھیں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مرد چلا رہے تھے اور ایک برقع پوش عورت پیچھے کیریئر پر بیٹھی تھی۔ پانچ چھ منٹ کے بعد ایک اور اسی قسم کی سائیکل نظر آئی لیکن برقع پوش عورت آگے ہینڈل پر بیٹھی تھی۔ دفعتہً خربوزے کے چھلکے پر سے سائیکل پھسلی۔ سوار نے بریک دبائے پھسلنے اور بریک لگنے کے

دوہرے عمل سے سائیکل الٹ کر گری میں دوڑ امداد کے لیے مرد عورت کے برقع میں لپٹا ہوا اور عورت بے چاری سائیکل کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ میں نے سائیکل ہٹائی اور اس کو سہارا دے کر اٹھایا مرد نے برقع میں سے منہ نکال کر میری طرف دیکھا اور کہا'' آپ تشریف لے جائیے ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں'' یہ کہہ کر وہ اٹھا عورت کے سر پر اوندھا سیدھا برقع اڑکایا اور اس کو ہینڈل پر بٹھا، یہ جا وہ جا۔۔۔۔۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ آگے سڑک پر خربوزے کا کوئی اور چھلکا نہ پڑا ہو۔

تھوڑی ہی دور دیوار پر ایک اشتہار دیکھا جس کا عنوان بہت ہی معنی خیز تھا'' مسلمان عورت اور پردہ۔''

بہت آگے نکل گیا۔ جگہ جانی پہچانی تھی مگر وہ بت کہاں تھا جو میں دیکھا کرتا تھا میں نے ایک آدمی سے جو گھاس کے تختے پر استراحت فرما رہا تھا، پوچھا'' کیوں صاحب یہاں ایک بت ہوتا تھا، وہ کہاں گیا؟''

استراحت فرمانے والے نے آنکھیں کھولیں اور کہا'' چلا گیا''

'' چلا گیا آپ کا مطلب ہے اپنے آپ چلا گیا؟''

وہ مسکرایا'' نہیں اسے لے گئے''

میں نے پوچھا'' کون''

جواب ملا'' جن کا تھا''

میں نے دل میں کہا'' لو اب بت بھی ہجرت کرنے لگے۔۔۔۔۔۔ ایک دن وہ بھی آئے گا جب لوگ اپنے اپنے مرد بھی قبروں سے اکھاڑ کر لے جائیں

گے۔''

یہی سوچتا ہوا قدم اٹھنے والا تھا کہ ایک صاحب نے جو میری ہی طرح ٹہل رہے تھے مجھ سے کہا ''بت کہیں گیا نہیں یہیں ہے اور محفوظ ہے۔''

میں نے پوچھا ''کہاں؟''

انہوں نے جواب دیا ''عجائب گھر میں''

میں نے دل میں دعا مانگی ''اے خدا! وہ دن نہ لائیو کہ ہم سب عجائب گھر میں رکھے جانے کے قابل ہو جائیں۔''

فٹ پاتھ پر ایک دہلوی مہاجر اپنے صاحبزادے کے ساتھ سیر فرما رہے تھے۔ صاحبزادے نے ان سے کہا ''ابا جان! ہم آج چھولے کھائیں گے۔''

ابا جان کے کان سرخ ہو گئے ''کیا کہا؟''

برخوردار نے جواب دیا ''ہم آج چھولے کھائیں گے''

ابا جان کے کان اور سرخ ہو گئے ''چھولے کیا ہوا، چنے کہو''

برخوردار نے بڑی معصومیت سے کہا ''نہیں ابا جان! چنے دلی میں ہوتے ہیں۔ یہاں سب چھولے ہی کھاتے ہیں'' ابا جان کے کان اپنی اصلی حالت پر آ گئے۔

میں ٹہلتا ٹہلتا لارنس باغ پہنچ گیا۔ وہی باغ تھا پرانا لیکن وہ چہل پہل نہیں تھی۔ صنف نازک تو قریب قریب مفقود تھی۔ پھول کھلے ہوئے تھے، کلیاں چٹک رہی تھیں۔ ہلکی پھلکی فضاء میں خوشبوئیں تیر رہی تھیں۔ میں نے سوچا، عورتوں کو کیا ہوا ہے جو گھر میں قید ہیں۔ ایسا خوبصورت باغ، اتنا سہانا موسم، اس سے لطف

اندوز کیوں نہیں ہوتیں۔۔۔۔۔۔لیکن مجھے فوراً ہی اس سوال کا جواب مل گیا۔ جب میرے کانوں میں ایک نہایت ہی بھونڈے اور سوقیانہ گانے کی آواز آئی اور جب میں لارنس باغ کی روشوں پر پھٹی پھٹی نگاہوں والے گوشت کے بے ہنگم لوتھڑوں کو محوِ خرام دیکھا تو مجھے دکھ ہوا اور اس دکھ میں اضافہ ہو گیا۔ جب میں نے سوچا کہ پھول بے کار کھل رہے ہیں۔کلیاں بے مطلب چٹک رہی ہیں۔یہ جوان کی طرف دیکھے بغیر چلے جا رہے ہیں۔یہ جوان کے تعطر سے بالکل بے خبر ہیں۔ کیا ان کی جگہ اس باغ کے بجائے کوئی ذہنی شفاخانہ نہیں۔کوئی مدرسہ نہیں جہاں ان کے دماغوں کی بند کھڑکیاں کھولی جائیں۔ان کی روحوں کے زنگ آلود تالے توڑے جائیں۔اگر کوئی ایسا نہیں کر سکتا میرا مطلب ہے اگر انسان کا ذہن عاجز ہے ان انسانوں کے ذہن کی اصلاح کرنے میں تو کیا وہ انہیں چڑیا گھر میں نہیں رکھ سکتا جو لارنس گارڈن ہی میں قائم رہے۔

میری طبیعت مکدر ہو گئی۔باغ سے باہر نکل رہا تھا کہ ایک صاحب نے پوچھا ''کیوں صاحب یہی باغ جناح ہے؟''

میں نے جواب دیا ''جی نہیں یہ لارنس باغ ہے''

وہ صاحب مسکرائے ''آپ چڑیا گھر سے تشریف لا رہے ہیں؟''

''جی ہاں!''

وہ صاحب ہنس پڑے۔قبلہ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے۔اس کا نام باغ جناح ہو گیا ہے میں نے ان سے کہا ''پاکستان زندہ باد'' وہ اور زیادہ ہنستے ہوئے لارنس باغ میں چلے گئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں دوزخ سے باہر نکلا ہوں۔

حقا کہ باعقوبت دوزخ برابر است
رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت

☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

یوم اقبال پر

معزز حاضرین اور میرے ہم قلم رفیقو!

یوم اقبال کی اس پہلی نشست کی صدارت کا اعزاز جو آپ نے مجھے بخشا ہے رسماً مجھے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے لیکن بندہ سرگشتہ رسوم و قیود نہیں۔

صدارت کی کرسی کی طرف دیکھ کر البتہ ایک الجھن سی ضرور ہوتی ہے۔ اتنی دیر گالیاں اور سٹھنیاں کھاتا رہا اور آج ۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن علامہ اقبال مرحوم کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اپنے زمانے میں لعن طعن کے علاوہ ان کو تو الحاد اور کفر کے فتوؤں سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔ ایسا سوچنے پر یہ الجھن تو کسی حد تک دور ہو جاتی ہے لیکن ایک دوسری الجھن جو اس وقت مجھے محسوس ہوتی ہے یہ ہے کہ شاعری سے مجھے اتنا شغف ہے جتنا مہاتما گاندھی کو فلموں سے تھا۔ بہر حال مجھے اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہیے جو آپ حضرات نے مجھے دیا ہے۔

اقبال کے کلام سے میرا سب سے پہلا تعارف ہوٹل کے بل سے ہوا۔ آج سے تقریباً پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ زندگی سے قطعاً مایوس ہو کر میں فرار کے طور پر کھیل کھیل رہا تھا۔ ایک رات، غم غلط کرنے کے سامان کے دام چکانے لگا تو بل کی پرچی کی پشت پر فارسی کا یہ مصرعہ نظر آیا۔

اگر خواہی حیات، اندر خطر زی

کسی ہم مشرب کی بروقت نصیحت تھی یا پیر مغاں کی شفقت آج یہ عالم ہے کہ زندگی چاہے مجھ سے مایوس ہو جائے میں اس سے مایوس ہونے کا کبھی نام نہیں

لیتا۔ مہنگے سے مہنگے داموں پر خطرے مول لیتا ہوں اور اونے پونے داموں بیچ دیتا ہوں لیکن خدا گواہ ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔

اقبال کے کلام سے مزید تعارف بھی اسی زمانے سے ہوا۔ ایک کتب فروش نے مجھے ڈرتے ڈرتے ''بالِ جبریل'' دکھائی اور سب سے پہلے وہ نظم پڑھنے کیلئے کہا جس کا عنوان شاید فرمانِ خدا ہے۔ ہم دونوں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بیک زبان ہو کر پڑھا۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

ان دنوں اقبال کو بالشویک یعنی روس کا ایجنٹ سمجھا جاتا تھا۔ آج جب کہ یہاں آزاد اسلامی حکومت قائم ہے۔ خدا کا یہی فرمان دہرانے کے لیے کمیونسٹ کہلاتے ہیں اور ان کے سر پر قانون کا عتاب منڈلاتا رہتا ہے لیکن خدا کا اتنا شکر ہے کہ اقبال کا کلام اس قسم کے احتساب سے آج کل محفوظ ہے۔

پچھلے دنوں یہ خبر سننے میں آئی کہ مغربی پنجاب کے ایک گاؤں میں مہاجر کسانوں نے اناج کے ایک بہت بڑے ذخیرے کو آگ لگا دی اس لیے کہ جاگیرداروں نے رات ہی رات اسے چرا کر اپنے گوداموں میں بھر لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ ضروری نہیں کہ مخلص آرٹسٹ کا پیغام کتابوں، تصویروں اور آوازوں ہی سے لوگوں تک پہنچے۔ جب کوئی آرٹسٹ ساز زندگی کے کسی تار کو چھیڑتا ہے تو اس کی لرزش کی گونج صدیوں تک فضاؤں میں تیرتی رہتی ہے اور کھینچ کر خود بخود دل کے ان تاروں تک پہنچ جاتی ہے جو اذیت دینے والے ہاتھوں نے جھنجھوڑے

ہوتے ہیں ورنہ ان پڑھ مہاجر کسانوں کو کیا معلوم تھا کہ بال جبریل میں آج سے بہت پہلے اقبال لکھ گیا تھا۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہء گندم کو جلا دو

اقبال کے کلام اور اس کے فلسفے کی باریکیاں بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس مجلس میں ایسے اصحاب موجود ہیں جو اس باوقار اور پر عظمت شاعر کے اس پیغام

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

کی تشریح بطریق احسن کر سکتے ہیں۔

مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے لیکن دو دکھ ہیں جن کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک دکھ اس وقت ہوا جب اقبال جیسے غیور شاعر کو بے حقیقت بادشاہوں کے قصیدے لکھنا پڑے۔ ایک دکھ مجھے اب ہو رہا ہے جب میں رموز بے خودی میں آسمانوں، زمینوں، ہواؤں، دریاؤں، پہاڑوں اور وادیوں، سورج، چاند اور ستاروں، پھلوں غرضیکہ ساری کائنات کو انسان کی میراث قرار دینے والے شاعر کے قلندرانہ کلام پر چند خود غرض مجاوروں کا قبضہ دیکھتا ہوں۔

اقبال نے خدا کے حضور دعا مانگی تھی۔۔۔۔۔۔۔ مرا نور بصیرت عام کر دے۔۔۔۔۔۔ یہ دعا جو ایک دردمند دل سے نکلی ضرور قبول ہو گی لیکن صاحبوں، تیلوں اور ہوٹلوں اور لانڈریوں کے ساتھ اس شاعر اعظم کا نام منسوب ہوتے دیکھ

کر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوت اہے کہ اس کا نور بصیرت بہت دیر تک جہالت کی تنگ اور اندھیری گلیوں میں بھٹکتا رہے گا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

محبوس عورتیں

تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کے بعد اس قدر مجلسی و معاشرتی مسائل پیدا ہوئے ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہوسکتا۔ یوں تو ہر شخص انہیں سلجھانے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شور زیادہ ہے اور کام بہت ہی کم ہو رہا ہے۔

برطانوی سامراج کی حکمت عملی نے وہ شاطرانہ چال چلی کہ ٹھنڈے سے ٹھنڈے دماغوں کو بھی سوچنے کا موقع نہ ملا۔ ہندوستان کو اس چابک دست جراح نے پتھر کی سرد سلوں پر لٹا کر چیرا پھاڑا۔ ایک سنگین سکون و اطمینان کے ساتھ اس کے حصے بخرے کئے اور یہ جا وہ جا۔ اور وہ جن کے تدبر، وہ جن کی دقیقہ رسی، وہ جن کی شاہین نگاہی کی سارے عالم میں دھوم تھی۔ آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

پچھلے چند مہینوں میں اس سرزمین پر جس کا نام کبھی ہندوستان تھا۔ خون کے وہ دریا بہے کہ جس پر چشم فلک بھی حیران ہے۔ فنا کو بادہ ہر جام بنایا گیا۔ دوسری اجناس نایاب مگر انسانی گوشت پوست کی دکانیں عام کھلی تھیں۔ ہر بازار میں ایک عام ٹکٹکی نصب تھی۔ ہر چوک میں ایک مقتل تھا۔ چنگیز اور ہلاکو، امیت تیمور گورگانی، نادر شاہ درانی اور بہیمت و بربریت کا تازہ ترین علمبردار اوڈلف ہٹلر بھی اگر ان خونیں مناظر کو دیکھتا تو یقیناً خود کو ناچیز سمجھتا لہو اور لوہا، جنگ اور تفنگ انسان کی تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں۔ اولاد آدم ان کھیلوں میں ہمیشہ دلچسپی لیتی رہی ہے مگر وہ کھیل جو پچھلے دنوں کھیلا جاتا رہا ہے۔ اس کی مثال ابن آدم کے رنگین فسانے میں کہیں بھی نہیں ملتی۔

خود کو حیوانوں سے کچھ اونچا رکھنے کے لیے انسان نے قتل و غارت گری کے لیے بھی کچھ آداب و قواعد بنا رکھے ہیں لیکن جس قتل و غارت گری کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ ان آداب و قواعد سے بے نیاز تھی بلکہ یوں کہئے کہ حیوانیت سے بھی یکسر مبرا تھی۔ جس کی تصویر شاید یہ قتل و غارت گری خود بھی نہ کھینچ سکے۔

اس وقت ہماری نظروں کے سامنے خون کی سوکھی ہوئی پپڑیاں کٹے ہوئے اعضا، جھلسے ہوئے چہرے، روندھے ہوئے گلے، ٹھٹھری ہوئی جانیں، لٹے ہوئے مکان، جلے ہوئے کھیت، ملبے کے ڈھیر اور بھرے ہوئے ہسپتال ہیں۔ ہم آزاد ہیں، ہندوستان آزاد ہے، پاکستان آزاد ہے اور ہم گرسنگی و برہنگی، بے سروسامانی اور بے حالی کی ویران سڑکوں پر چل پھر رہے ہیں۔

گندم نہیں ہے، روٹی نہیں ہے، چاول نہیں ہے، گرانی ہے، قحط ہے، بیماریوں کی یلغار ہے، سردیوں میں آگ نہیں، گرمیوں میں پانی نہیں، زمینیں سکڑ گئی ہیں، آسمان سکڑ گئے ہیں، تدبیر کے گھسے ہوئے ناخن یہ پیچیدہ گرہیں کھولنے میں مصروف ہیں اور ہم محو تماشا ہیں۔

ٹھنڈی زمینوں پر لٹی ہوئی ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ کے آخری قطرے منجمد ہو رہے ہیں۔ قدرت کا بے رحم ہاتھ بچوں کو ان کے آخری اثاثے سے محروم کر رہا ہے لیکن ایسی حویلیاں بھی ہیں جہاں ننھے کا بچا ہوا دودھ موریوں میں بہایا جاتا ہے۔ لاکھوں ستم رسیدہ تن ڈھانپنے کے لیے ایک چیتھڑے کو ترس رہے ہیں لیکن وہ بھی ہیں جو فیشن کی نوک پلک درست رکھنے کے لیے طرح طرح کے ملبوسات سے اپنی الماریاں سجائے بیٹھے ہیں۔

یہ تماشا کب تک جاری رہے گا۔ کب تک مظلوم انسانیت کپڑے کے پھٹے ہوئے خیموں میں قید رہے گی، کب تک مجبور نسوانیت تحفظ کی نام نہاد چار دیواری میں شہوانیت کی شکار ہوتی رہے گی۔ کب تک غربت و بے چارگی سرمائے کے ہاتھوں فروخت ہوتی رہے گی۔ کب تک؟

ہماری بٹی ہوئی تہذیب ہمارا تقسیم شدہ تمدن، ہمارا بچا ہوا تن۔ ہر وہ چیز ہمارے ہی جسم سے کٹ کر ہمیں ملی ہے۔ مغربی سیاست کے بھوبل میں دفن ہے۔ ہمیں ان سب کو نکالنا ہے، جھاڑنا پونچھنا ہے، تروتازگی بخشنا ہے اور اس طوفان میں جس جس شے سے ہم محروم ہوئے ہیں اسے دوبارہ حاصل کرنا ہے لیکن سب سے پہلے ہمیں ان زخموں کی دیکھ بھال کرنا ہے جو ذرا سی غفلت پر ناسور بن جانے والے ہیں۔ سب سے بڑا گھناؤنا زخم ان عورتوں کا وجود ہے جن میں سے کچھ ہماری بزدلی کے باعث بے لگام شہوانیت کا شکار ہوئیں اور کچھ مخالفین کی ''شہزوری'' کا نشانہ مشق بنیں۔ کہا جاتا ہے ایسی پچاس ہزار عورتیں موجود ہیں، مائیں، بہنیں اور بچیاں ان میں سے چند ہزار کی بازیابی ہو چکی ہے۔ جو باقی ہیں ابھی تک شہوت کے تنوروں میں ایندھن کا کام دے رہی ہیں۔

پچھلے دنوں قائدین ملت کے ایماء پر ان مظلوم و مقہور عورتوں کی بازیابی کی مہم بڑے زور شور سے شروع ہوئی تھی مگر افسوس ہے کہ اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمیں اس کا اتنا زیادہ گلہ نہیں اس لیے کہ اس مہم کا انحصار زیادہ تر فریق ثانی کے دل پگھلنے پر تھا لیکن اس بات کی شکایت ہمیں ضرور ہے کہ ان عورتوں کے متعلق جو ہمیں واپس مل چکی ہیں۔ نفسیات کی روشنی میں بہت کم غور کیا گیا ہے۔

ان گھائل روحوں کے لیے کسی جیل میں ایک وارڈ مخصوص کر دینے سے اور تفریح کے لیے وہاں ایک عدد ریڈیو سیٹ لگا دینے سے یا کسی خوش پوش امیر زادی کے معائنے میں ان کی تقدیر کی رفو گیری نہیں ہو سکتی اور پھر ان کے تاریک مستقبل کو روشن بنانے کے لیے یہ بھی کوئی حل نہیں کہ ان کو سپاہیانہ تعلیم دے کر ''فوجی گوروں'' کی تانیث بنا دیا جائے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے اس نشان کو مٹانے کی کوشش کی جائے جو ان تقدیر کی بیٹیوں کی پیشانی پر حادثات کی سیاہی لگا گئی ہے اور اس کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے لیے اپنی معاشرت میں صحت افزا جگہ پیدا کی جائے۔

یہ عورتیں غریب ہوں یا امیر، کنواری ہوں یا بیاہی ہوئی، مال گاڑی کا نقصان رسیدہ اسباب نہیں جو انہیں کچھ دن گودام میں رکھ کر نیلام پر چڑھا دیا جائے اور اگر کچھ مصرف سمجھ میں نہ آئے تو انہیں تلف کر دیا جائے۔

ہزاروں عورتوں کا سوال ہے جو کبھی ماؤں کی بیٹیاں، بھائیوں کی بہنیں اور شوہروں کی بیویاں تھیں۔ جس حالت میں یہ اب ہیں اس کی ذمہ دار سیاست کی اکھاڑے بازی ہے۔ مذہب کا وہ جنون ہے جس کی مثال انسانوں کی پچھلی تاریخ میں کہیں بھی نہیں ملتی اور کچھ نہیں تو ان عورتوں کے وجود کو اپنا ہی گناہ سمجھ کر ہمیں پردہ پوشی کرنی چاہیے۔

اگر فوری طور پر کچھ نہ کیا گیا تو ان عورتوں کا شکستہ حال ایک بہت ہی خوف ناک خرابی میں تبدیل ہونے والا ہے سینکڑوں بلکہ ہزاروں قحبہ خانے منہ کھولے

ان کے استقبال کے لیے تیار ہیں۔ ہمیں اس کے تصور ہی سے کانپ جانا چاہیے اور پھر وہ بچے ہیں جو کئی عورتوں نے اپنی مجبور کوکھ سے پیدا کئے ہیں۔ اس خودرو پود کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کون ہے۔ کون ہوگا اور کون ہوسکتا ہے یہ آپ کو سوچنا ہے یہ مجھے سوچنا ہے، یہ ہمارے ان رہنماؤں کو سوچنا ہے جو اس سرزمین کے خاوند ہیں اور سب سے پہلے یہ سوچنا ہے کہ وہ لوگ صرف سوچنے کی خاطر سوچتے ہیں۔ عملی زندگی میں ان کا کیا مصرف ہے؟ یہ مسائل ایسے ہیں کہ ان پر فوری تدبر اور عمل کی ضرورت ہے۔ کرسی نشین فکر و عمل اور تن آسان تدبیر و تنظیم سے ہمارے مجلسی دائرے کا یہ چاک ہرگز ہرگز رفو نہ ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ملک کے تمام ماہرین نفسیات مل کر ان مظلوم عورتوں اور ان کی جبری اولاد کے لیے زندگی میں ایک صاف اور ہموار راستہ تلاش کریں تاکہ یہ سماج کے جذباتی قوانین کی ٹھوکروں سے بچے رہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور یہ نازک مسئلہ اناڑیوں کے سپرد رہا تو اندیشہ ہے کہ حالات تاریک سے تاریک ہو جائیں گے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اخباروں میں ان عورتوں کے فوٹو شائع کرنے سے کس قسم کا اثر پیدا کرنا مقصود ہے۔ دیکھنے والے ان کے چہروں کی مصنوعی مسکراہٹیں ضرور دیکھتے ہیں لیکن سمجھنے والی بخوبی سمجھتے ہیں کہ یہ کاغذ ان کی آنکھوں کے وہ آنسو جو کہ وہ بہا چکی ہیں اور جو آئندہ بہانے والی ہیں۔ ہرگز خشک نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ ان عورتوں کے وجود کی ایسی عامیانہ تشہیر غایت درجہ قابل اعتراض ہے۔ افسوس ہے کہ جو کام ہمیں خاموشی، سنجیدگی اور متانت سے کرنا چاہیے تھا۔ اس میں غیر ضروری بلند آہنگی برتی جا رہی ہے۔ یہ سراسر پھوہڑپن ہے۔ جو حقیقت ہے اور

ایک بہت ہی تلخ حقیقت ہے ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں رہنی چاہیے۔ یہ تلخ حقیقت انسانیت کی اس ذلت آفرین افتاد کے سوا اور کیا ہے جس نے ان معصوم عورتوں سے ایسا گھناؤنا سلوک کیا۔ ہمیں رجائی بن کر اسی انسانیت سے رجوع کرنا چاہیے تا کہ وہ اپنے پہنچائے ہوئے نقصان کی تلافی کر سکے۔ انسانیت کا گناہ سب انسانوں کا گناہ ہے۔ وہ عظیم ترین گناہ جو چند گمراہ انسانوں سے سرزد ہو چکا ہے۔ آیئے ہم سب مل کر اس کا کفارہ ادا کریں کہ اسی میں ہماری ان عورتوں کی، ان کے بچوں کی، پاکستان اور اور ہندوستان کی بھی نجات مضمر ہے۔

ہم جانور پال سکتے ہیں۔ حیوانوں کو اپنے سینے سے لگا سکتے ہیں۔ کیا ہم ان عورتوں اور ان کے بچوں کو اپنے گھر میں جگہ نہیں دے سکتے؟ یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب سب سے پہلے ہمارے رہنماؤں کو دینا چاہیے تا کہ عوام کو جو تقلید کے عادی ہیں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کا موقع ملے۔

☆☆☆☆☆

ایمان وایقان

یو این او ریڈیو

ہم کامیابی کی جھیل کی گہرائیوں سے بول رہے ہیں، امن پسند لوگ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ روس اور امریکہ کے تنازعے کا خاطر خواہ فیصلہ ہو گیا ہے۔ طے پایا ہے کہ ان دونوں حکومتوں کی ایٹمی طاقت کی اوپن ائیر نمائش ہو۔ اس دنگل میں جس کے دم خم دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے۔ دنیا کی باگ ڈور تھامنے کا اہل قرار دیا جائے گا۔ چار بڑی طاقتوں نے اپنے اپنے مصنف اس دنگل میں حصہ لینے کے لیے بذریعہ جٹ پروپلڈ ہوائی جہاز روانہ کر دیئے ہیں۔ قوی امید ہے کہ دنیا کے اس سب سے بڑے تنازعے کا فیصلہ دوستانہ فضاء میں بطریق احسن ہو جائے۔

یو ایس اے ریڈیو

ہم چار بڑی آزادیوں کی کوکھ سے بول رہے ہیں، کامیابی کی جھیل کی گہرائیوں میں ہمارے اور روس کے تنازعے کا جو فیصلہ ہوا ہے۔ اس وقت تک کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک ایٹمی طاقت دریافت کرنے کے معاملے میں فریق ثانی ہمیں مجتہد تسلیم نہ کر لے۔ ہم دنگل لڑنے کے لیے بسر و چشم تیار ہیں لیکن

اکھاڑے میں پہلے ہمارا مد مقابل ہمیں اپنا استاد تسلیم کر لے۔

یو ایس ایس آر ریڈیو

ہم ہتھوڑے اور درانتی کی آواز کے ساتھ بول رہے ہیں۔فریق ثانی کے بلند باگ دعوے ہم سن چکے ہیں۔ پدرم سلطان بود کا زمانہ لد گیا۔امریکہ کولمبس نے دریافت کیا تھا لیکن اس غریب کے فلک کو بھی ایٹمی طاقت کا علم نہیں تھا۔ہم اس میدان میں طفل مکتب ہی سہی لیکن پنجہ ڈال کر دیکھ لیا جائے کہ طاقتور کون ہے۔

یو این او ریڈیو

ہم کامیابی کی جھیل میں خوشی کے گیت گاتے اور ڈبکیاں لگاتے ہوئے بول رہے ہیں۔ ہمارے خوشی کے گیت کے پہلے بول یہ ہیں کہ روس اور امریکہ نے ایک دوسرے کو چند سیاسی سٹھنیاں دینے کے بعد یورینیم اور پلوٹینیم پر ہاتھ رکھ کر صاف دنگل لڑنے کا حلف اٹھالیا ہے۔

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

یو ایس ایس آر ریڈیو

یورینیم اور پلوٹینیم پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانے کے بعد ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کا احترام کریں۔ چنانچہ بین الاقوامی قواعد وضوابط کے پیش نظر مسابقت کے

دنگل میں حصہ لینے سے پہلے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ نمونے کے طور پر ایک ایٹم بم امریکہ روانہ کر دیں تا کہ وہاں کے ماہرین اچھی طرح ٹھونک بجا کر اس کی طاقت کا اندازہ کر لیں۔ جس سے ہمارے دعوؤں کا جھوٹ سچ ان پر واضح ہو جائے گا۔ نمونے کے اس ایٹم بم کی روانگی کے وقت کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

یو ایس اے ریڈیو

اجتہا اور پہل ہمیشہ ہمارا حصہ رہا ہے اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ایٹم بم کا نمونہ پہلے یہیں سے روانہ کیا جائے۔۔۔۔۔ چنانچہ چار بڑی آزادیوں کے نقارے پر چوٹ لگا کر اس کا علان کیا جاتا ہے کہ آج چار بج کر سوا چھیالیس منٹ، گرین وچ ٹائم پر چچا سام اپنے بہترین اور خوبصورت ترین ایٹم بم کا نمونہ روس کے ماہرین کی جانچ پڑتال کے لیے روانہ کر دیں گے۔

یو ایس ایس آر ریڈیو

(ہوم سروس) امریکہ سیایٹم بم کی روانگی پر متحدہ جمہوریہ روس میں جو خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی ہے۔ سرخ قائدین کے نزدیک بہت ہی شرمناک ہے ہمارے سائنس دان جو ایٹم بم کی رگ رگ اور نخ نخ سے واقف ہیں اس کے استقبال کے لیے چشم براہ ہیں۔

یو ایس ایس آر ریڈیو

درانتی اور ہتھوڑے کی مار اور کاٹ کا فیصلہ آج ہو جائے گا ہم نے بھی آج چار بج کر سوا چھیالیس منٹ، گرین وچ ٹائم پر اپنا برا بھلا ایٹم بم نمونے کے طور پر امریکہ کے ماہرین کی خدمت میں روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے یہ بم 500 میل فی گھنٹے کی رفتار سے مسافت طے کرے گا۔

یو ایس اے ریڈیو

(ہوم سروس) ہمارے سائنس دانوں نے عظیم ترین دوربینوں کے ذریعے سے روس کے بھیجے ہوئے ایٹم بم کا معائنہ کر لیا ہے اور یقین دلایا ہے کہ وہ اسے واپس بھیجنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لیے لوگوں کو بے وجہ مضطرب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

یو ایس اے ریڈیو

ہمارا بھیجا ہوا نمونے کا ایٹم بم اس بم سے دس ہزار گنا بڑا ہے جو ہم نے ہیروشیما پر گرایا تھا۔ امید ہے روس کے ماہرین نے اب تک اس کا اندازہ کر لیا ہوگا جو ایٹم بم روس نے ہماری طرف روانہ کیا ہے اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

یو ایس ایس آر ریڈیو

قد و قامت اور ڈیل ڈول کی طرف از منہ عتیق کے لوگ دیکھتے تھے۔ عہد جدید میں اس پرانے گز سے کسی کی طاقت ماپنا از حد مضحکہ خیز ہے۔ امریکہ کے ایٹم بم کی حقیقت ہمارے سائنس دانوں نے دور ہی سے دیکھ کر معلوم کر لی ہے اور وہ گر بھی اپنے معملوں میں تلاش کر لیا ہے جس سے امریکہ کی یہ سوغات شکریئے کے ساتھ لوٹائی جا سکے گی۔

یو ایس اے ریڈیو

ہماری تیاریوں میں صرف ایک انچ کی کسر تھی مگر اب ہم بصد فخر و ابتہاج یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے قابل سائنس دانوں نے روس کے ایٹم بم کو عین جب کہ وہ ہماری سرحدوں میں داخل ہونے والا تھا کہ ممک ریز کے زور سے دھکا دے کر واپس روس بھیج دیا ہے۔

یو ایس ایس آر ریڈیو

ہم نے امریکہ کے ایٹم بم کو ایسا ریلا دیا ہے کہ پانچ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آنے کے بدلے اب یہ سات سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے واپس جا رہا ہے لیکن اس کے برعکس ہمارا ایٹم بم بہت سست رفتاری سے ہماری پاس واپس آ رہا

ہے۔

یو ایس اے ریڈیو

رفتار تیز اور سست کرنا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ حکم دے دیا گیا ہے کہ روسی ایٹم بم کی واپسی کی رفتار سات سو میل فی گھنٹہ کر دی جائے۔

یو این او ریڈیو

ہم کامیابی کی جھیل کی نیلاہٹوں سے بول رہے ہیں اور دنیا کو یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ ہم نے دنگل کا موقع ہی نہیں آنے دیا اور روس اور امریکا کی ایٹمی طاقتوں کو برابر چھٹرا دیا ہے۔ وہ دو ایٹم بم جو طرفین نے نمونے کے طور پر ایک دوسرے کو بھیجے اور واپس کیے تھے۔ ابھی تک فضاؤں کو چیر رہے ہیں۔ لیکن سیکیورٹی کونسل کی سفارش پر خیر سگالی کے اشارے کے طور پر دونوں طاقتیں ان بموں کا رخ کسی اور طرف پھیر دیں گی۔

اے آئی ریڈیو

آج بھور سمے چھم سیا یک بہت بڑا بھیانک پونچھ والا تارا آکاش پر نکلا اور آن کی آن میں ہمارے سروں پر آ کر لٹک گیا۔ جتنا میں اس کا رن بہت ڈر اور بھے اپتن ہو گیا ہے۔

اے پی ریڈیو

دمدار سیارہ جس کے طلوع ہونے کی خبر اس سے پیشتر نشر کی جا چکی ہے۔ فضاؤں میں اسی طرح معلق ہے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ آہستہ آہستہ زمین کی طرف آ رہا ہے۔ حکومت نے اس کے بارے میں معتبر رپورٹ تیار کرانے کے لیے سکولوں کے تمام ہوشیار سائنس ماسٹروں اور کالجوں کے تمام لائق پروفیسروں کی ایک جماعت تیار کی ہے امید ہے کہ بہت جلد اس دمدار سیارے کی وجہ نمود معلوم ہو جائے گا۔

اے آئی ریڈیو

آکاش پر پونچھ والے تارے کے پرگٹ ہونے سے جنتا میں بھے اور بھی ادھک ہو گیا ہے۔ پرنتو بھارت سرکار کے رکھشا منتری نے جنتا کو اشواسن دلایا ہے کہ اس بھینکر گرہ کو ٹالنے کی یوجنائیں سوچی جا رہی ہیں بڑے بڑے پنڈتوں اور اچاریوں کو اس کٹھنائی کا بھید جاننے پر لگا دیا گیا ہے۔

اے پی ریڈیو

سکول کے ماسٹروں اور کالج کے پروفیسروں نے سائنس کی ساری کتابیں چھان ماری ہیں مگر انہیں اس دمدار ستارے کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ جواب

زمین کی طرف پہلے کی بہ نسبت اور زیادہ سست رفتاری سے نیچے اتر رہا ہے۔ علماء دین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ سیارہ قہر خدا ہے جو ہم پر نازل کیا ہے۔ چنانچہ عوام سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس بلا کو ٹالنے کے لیے خدائے عزوجل ہی سے رجوع کریں۔ طے پایا ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے بڑے بڑے میدانوں میں لوگ جمع ہوں اور ننگے سر دعا مانگیں۔

اے آئی ریڈیو

جن پنڈتوں اور اچاریوں کو پوچھ والے ستارے کے بھید کی کھوج پر لگا دیا گیا تھا۔ اس پری نام پر پہنچے ہیں کہ مانو وگیان اس ستارے کے رس کو جاننے میں اسمرتھ ہے۔ پراچین رشیوں کی نیتی کے انوسار بھارت سرکار نے یہ نشچے کیا ہے کہ کورو کھشیتر کے اتہاسک میدان میں ایک مہان یگ رچایا جائے۔ اس یگ میں ویدوں کے دھرندر پنڈت تتھا ودوان سملت ہوں گے۔ ایک مہان ہون کے لیے سامگری اکٹھی کی جا رہی ہے۔ میسور کے سارے چندن کے بن کٹوا کر یگ استھان پر لائے جا رہے ہیں۔ ایک وانی ویر نے ایک لاکھ ٹین شدھ گھی کے پرتی دن دینے کا پرن کیا ہے۔ سادھوؤں تتھا یاتریوں کے بھوجن آدی پر دس کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ پورن آشا ہے کہ مہا پربھو پرمیشور کی اپار دیا سے یہ کٹھن گھڑی ٹل جائے گی۔

اے پی ریڈیو

میدانوں میں ننگے سر اجتماعی دعائیں مانگنے، دس کروڑ کالے بکروں کی قربانی دینے اور تمام اولیاء کرام کے مزاروں پر نذر و نیاز اور چادریں چڑھانے کے ساتھ ساتھ حفظ ماتقدم کے طور پر زمین میں جگہ جگہ سرنگیں اور گڑھے کھودنے کا کام بھی جاری ہے۔ اگر خدانخواستہ دمدار سیارہ نیچے آ رہا تو یہ سرنگیں اور گڑھے خاطر خواہ بچاؤ کی صورت پیدا کر دیں گے۔

اے آئی ریڈیو

مہان یگ پھلنا پورو ک ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھارت سرکار کے رکھشا منتری نے جنتا کے بچاؤ کے لیے بیس کروڑ آدمیوں کی ایک بھاری سینا کو ایک سرنگ کھودنے پر لگا دیا ہے جو پاتال تک جائے گی۔ اوشکتا پڑنے پر یہ سرنگ سب زناریوں کے لیے رکھشا استھان کا کام دے گی۔

ایس ایچ ریڈیو

ہم ساتویں آسمان سے بول رہے ہیں۔ پستیوں سے اطلاع وصول ہوئی ہے کہ وہاں دو بستیوں میں بڑے خضوع و خشوع سے دعائیں مانگی جا رہی ہیں کہ خدا ان کو انسان کے اپنے بنائے ہوئے تباہ کن بموں سے نجات دلائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ذات رحیم و کریم ہے اور اس کے حضور صدق دل سے مانگی ہوئی دعا کبھی خالی نہیں جاتی لیکن پستیوں کی ان دو بستیوں کے باشندوں کے

ایمان و ایقان کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ حفاظت کے لیے ایک ہاتھ دعا کے لیے آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے زمین میں گڑھے اور سرنگیں کھودتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

پردے کی باتیں

پردہ اٹھتا ہے:

بازار میں ایک آدمی سٹول پر کھڑا ہے منہ سے بھونپو لگائے اور ہاتھ میں بہت بڑی قینچی پکڑے چلا رہا ہے ''اگر میں نے کسی مسلمان عورت کو اس بازار میں بے پردہ گزرتے دیکھا تو اس قینچی سے اس کی چٹیا کاٹ دوں گا۔''

درزی کی دکان میں ادھڑا ادھڑ برقعے سئے جا رہے ہیں۔ کام کے ساتھ ساتھ باتیں بھی جاری ہیں۔ ''یار جناح صاحب کی ہمشیرہ کیوں نہیں پردہ کرتیں؟''

''معلوم نہیں''

''وزیر اعظم صاحب کی بیگم صاحبہ بھی ہیں وہ بھی ننگے منہ پھرتی ہیں۔''

''امیر آدمیوں کو پردے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

''کسی مولوی سے پوچھنا چاہیے۔''

کالج میں مباحثہ ہو رہا ہے۔

لڑکی جذبات بری آواز میں کہتی ہے ''صرف عورتوں کے حقوق دبانے کی خاطر اور انہیں معاشرتی سرگرمیوں سے دور رکھنے کے لیے مرد ان پر پردہ عائد کرنا چاہتے ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے مسلمان عورتیں

مردوں کے دوش بدوش جنگ میں حصہ لیتی رہی ہیں ۔۔۔۔۔ پردہ بہت بڑی زیادتی ہے ۔ بہت بڑا ظلم ہے، وہ لوگ جو اس کے حامی ہیں ۔ ان کو چاہیے کہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں ۔ پچاس ہزار عورتیں مشرقی پنجاب میں رہ گئی ہیں کیا ان کی تباہی کا باعث یہ زبردستی حائد کیا ہوا پردہ نہیں ہے ۔''

لڑکا میز پر مکہ مار کر کہتا ہے ''خدا کی قسم! میں پردے کا بالکل حامی نہیں میں چاہتا ہوں کہ یہ لعنت حرف غلط کی طرح مٹ جائے لیکن صرف بحث کی خاطر مجھے بڑے زور سے کہنا پڑتا ہے کہ پردہ عورت کے لیے اشد ضروری ہے ۔ اگر عورتیں بے پردہ چلیں پھریں گی تو نظام معاشرت بالکل درہم برہم ہو جائے گا ۔ فاسد خیالات کا دور دورہ ہوگا اور مرد بالکل حیوان بن جائیں گے ۔ عورتوں کو صرف اسی خوف سے کہ مرد کہیں حیوان بن جائیں فوراً پردہ اختیار کر لینا چاہیے ۔''

گلی میں چھوٹے چھوٹے بچے اور چھوٹی چھوٹی بچیاں کھیل رہی ہیں ۔ ایک بچہ دفعتاً ایک بچی سے کہتا ہے ''تمہیں شرم نہیں آتی ننگی پھر رہی ہو، جاؤ برقع پہن کر آؤ ''

بچی جواب دیتی ہے ''میں برقع نہیں پہنتی لیکن تم ننگے پاؤں کیوں پھرتے ہو؟''

کافی ہاؤس میں ایک لمبے بالوں والا آدمی اپنے دوستوں سے کہہ رہا ہے ''پردہ لا یعنی ہے پردہ ہوتا ہے جہالت کا، پردہ ہوتا ہے غفلت کا، راز کا، گمنامی

کا۔۔۔عورت جہالت نہیں، غفلت نہیں، راز نہیں، گمنامی نہیں۔۔۔۔۔۔پھر اس کا پردہ کیا؟''

بھٹیار خانے میں ایک داڑھی والا سامعین سے کہہ رہا ہے:

''بحکم بصیغہ امر تو یہی ہے کہ عورت اپنی زینت چھپائے۔استثنیٰ بصیغہ امر نہیں ہے کہ فلاں حصہ جسم کا چھپایا جائے۔استثنیٰ کے الفاظ ہیں ''الا ما ظہر منھا'' صرف اس بات کا ہے کہ اگر زینت کا کوئی جزو اتفاق طور پر یا مجبوری سے ظاہر ہو جائے گا تو اس پر گرفت نہیں۔اگر جسم یا آرائش کے کسی خاص حصے کو ظاہر کرنا عام طور پر جائز کرنا مقصود ہوتا تو آیت میں کہا جاتا کہ اپنی زینت کو چھپاؤ، بجز فلاں فلاں چیز کے۔۔۔۔۔''الا ما ظہر منھا'' سے یہ مراد لینا کہ منہ اور ہاتھ کھلے رکھے جائیں صحیح نہیں۔اس لیے کہ غیر ارادی طور پر اس سے بھی زیادہ حصہ جسم کا ظاہر ہو جانا قابل گرفت نہ ہوگا اور مجبوری نہ ہو تو سارے جسم کو چھپانا عورت کے لیے ضروری ہے۔''

دیہات میں ایک جاٹ اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے ''نیک بختے! ایہہ چدر چھڈ برخا بتڑ دا۔اوجیہڑا تنبو وانگ ہندا اے''

ایک آدمی اپنے خواندہ دوست سے خط لکھوا رہا ہے:

''جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!''

الحمدللہ! پاکستان قائم ہو چکا ہے اور شریعت اسلامی نافذ ہو چکی ہے جوتھیکا رائے کا یہ گانا ''گھونگھٹ کے پٹ کھول تو رے پیا ملیں گے'' فوراً ضبط ہونا چاہیے کہ یہ پردہ دار عورتوں کو بہکانے کا موجب ہو سکتا ہے۔

ٹی ہاؤس میں ایک ترقی پسند کہہ رہا ہے ''پردے کے مسئلے پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ستر پوشی کا خیال پہلے باوا آدم کے دل میں پیدا ہوا یا اماں حوا کے دل میں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ شروع شروع میں دونوں اس سے غافل تھے لیکن جب ہابیل اور قابیل پیدا ہوئے تو باوا آدم کو اپنی بیوی کی ستر پوشی کا خیال آیا۔۔۔۔اور انسان کا سب سے پہلا لباس انجیر کے پتوں سے تیار ہوا۔۔۔اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ عورت کے کس حصہ جسم کی ستر پوشی آدم نے سب سے پہلے ضروری سمجھی۔۔۔۔۔''

بازار میں ڈھنڈورا پٹ رہا ہے

آج شام کو چھ بجے منٹو پارک میں جس کا اسلامی نام باغ عدن رکھا گیا ہے۔ مولانا گل داؤدی کے زیر صدارت ایک عظیم الشان جلسہ ہو گا۔ جس میں بیگم لیاقت علی خان کے اس بیان کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہو گی جو انہوں نے بے پردگی کی حمایت میں دیا ہے۔

مال روڈ پر فٹ پاتھ کے ساتھ گھاس کی روش پر ایک آدمی آلتی پالتی مارے

بیٹھا ہوا ہے اور اپنے دوستوں سے کہہ رہا ہے۔

''پردہ کرنے والی عورتوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو ان کی ہے جو صرف اپنے رشتہ داروں سے پردہ کرتی ہیں، نامحرم مردوں سے انہیں کوئی حجاب محسوس نہیں ہوتا۔ ایک قسم ان کی بھی ہے جن کا پردہ اپنی گلی کے مردوں تک محدود ہے۔ سارے شہر میں پردہ در بغل یا پردہ بدوش پھرتی رہیں گی لیکن گلی میں داخل ہوتے ہی پردہ پوش ہو جائیں گی لیکن خطرناک قسم ان عورتوں کی ہے جو پردہ کرتی ہیں لیکن درپردہ پردہ نہیں کرتیں۔''

گھر میں ایک بزرگ اپنی اولاد سے مخاطب ہیں ''اس وقت ہندوستان میں میرا مطلب ہے پاکستان میں، دو لعنتیں بہت عام ہیں۔ بے پردگی اور ترقی پسندی۔ دونوں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے بے پردگی سے بے حیائی پیدا ہوتی ہے اور ترقی پسندی سے فحش نگاری''

سڑک پر ایک آدمی اخبار پڑھ رہا ہے۔

''لاہور کے ایک مجسٹریٹ نے آج ایک آوارہ نوجوان کو جس کا نام اسلم ہے دفعہ 109 کے ماتحت دو ماہ قید سخت کی سزا دی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ملزم برقع پہن کر میکلوڈ روڈ پر چہل قدمی کر رہا تھا۔''

تانگہ میں ایک برقع پوش لڑکی اپنی برقع پوش سہیلی سے کہتی ہے ''آج ہمیں

سائنس ماسٹر نے بتایا کہ سیاہ چیزیں حرارت کو بہت زیادہ کھینچتی ہیں۔ پھر یہ کالے برقعے کیوں پہنے جاتے ہیں۔"

کلاس میں استاد لڑکوں سے پوچھتا ہے" پردے کا سب سے بڑا حامی کون ہے؟"

ایک لڑکا جواب دیتا ہے وہ شاعر جس نے یہ شعر کہا

مری لحد پہ کوئی پردہ پوش آتا ہے
چراغ گور غریباں صبا بجھا دینا

استاد: شاباش!۔۔۔۔۔۔۔۔پردے کے خلاف کون کون سے شاعر تھے؟

لڑکا: سبھی تھے لیکن ان میں غالب مشہور ہے کہتا ہے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا کیجئے

کلب میں شغل مے نوشی جاری ہے۔ ایک خوش پوش نوجوان چہک رہا ہے۔ نہیں نہیں پردہ ضرور ہونا چاہیے اور برقعے سفید نہیں کالے ہونے چاہیے۔ نئے فیشن کے۔۔۔۔گورے گورے ہاتھ مہین نقاب تھامے ہوں۔ کبھی ہوا کے جھونکے سے یہ حریری پردہ لرز کر تھوڑا سا اڑ جائے۔۔۔۔۔بس دیکھا کرے کوئی۔۔۔۔۔۔۔خدا جنت میں سب سے اونچا مقام دے اس برقعے کے موجد کو۔۔۔۔۔۔۔۔کبھی کان کا جھمکا جھلک دکھا جاتا ہے، کبھی آم کی کیری ایسی

ٹھوڑی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور وہ ہونٹوں کی جیتے جیتے لہو جیسی سرخی ۔۔۔۔۔

ملکہ کے بت کے پاس ایک لڑکا اپنے دوست سے کہتا ہے:

''یہ نقاب کشائی کی رسم کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جب مجسمہ تیار ہوتا ہے تو اسے کوئی نہیں ڈھانکتا۔لیکن جونہی نصب کیا جاتا ہے تو اس پر کالی چادر چڑھا دیتے ہیں اور کسی بڑے آدمی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس کی نقاب کشائی کرے۔

میرا خیال ہے یہ پردے کا سلسلہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔''

ایک آدمی اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے''میں پردہ کا حامی ہوں لیکن میں نے قبلہ دادا جان سے سنا تھا کہ علی گڑھ میں ایک دفعہ صرف اس لیے بلوہ ہو گیا تھا کہ ایک عورت بے پردہ باہر نکل آئی تھی۔۔۔۔۔۔۔اس لیے بھئی تم پردہ نہ کرو تو بہتر ہے۔''

دیوار پر ایک اشتہار چسپاں ہے:

برقعہ پہن کر بحفاظت چلنے کی تعلیم دینے والا پہلا اسلامی مدرسہ

ہم نے دیہاتی عورتوں اور ان خواتین کے لیے جو پردے کی عادی نہیں ہیں، برقع پہن کر سڑکوں پر بحفاظت چلنے پھرنے اور سائیکل چلانے کی تعلیم دینے کے لیے ایک سکول قائم کیا ہے۔ایک مہینے کے اندر اندر ہر عورت کو ایکسپرٹ برقع

پوش بنانے کی گارنٹی دی جاتی ہے۔آزمائش شرط ہے فیس بالکل واجبی ہے دوران تعلیم میں برقعہ سکول مفت مہیا کرے گا۔

پردہ گرتا ہے

☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

مفت نوشوں کی تیرہ قسمیں

پہلی قسم

آپ سینما ہال میں بیٹھے ہیں ڈبہ کھول کر سگریٹ نکالتے ہیں برابر کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تماشائی مفت نوش ہے۔ وہ آپ کے ڈبے کو غور سے دیکھے گا اور کہے گا ''کیوں صاحب! آپ یہ سگریٹ کہاں سے لیتے ہیں بلیک مارکیٹ سے؟''

''جی ہاں''

''اوجبھی ۔۔۔۔۔۔۔ ورنہ میں بہت تلاش کر چکا ہوں کہیں ملتا ہی نہیں بہت اچھا سگریٹ ہے۔''

''شوق فرمائیے''

''شکریہ''

انٹرول کے بعد وہ خود آپ سے سگریٹ مانگے گا ''صاحب لطف آ گیا ناگوار خاطر نہ ہو تو ایک اور عنایت فرمائیے۔''

دوسری قسم

آپ ریل گاڑی میں سوار ہوتے ہیں۔ گاڑی چلتی ہے۔ آپ پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہیں تو ایک دم آپ کے ساتھ بیٹھا ہوا مسافر اپنی جیبیں

ٹٹولنا شروع کر دیتا ہے۔اس کے منہ سے کچھ اس قسم کا کلمہ نکلتا ہے ''لعنت'' یا ''حد ہوگئی'' آپ ضرور پوچھیں گے ''کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں صاحب! سگریٹ کا ڈبہ ٹانگے میں رہ گیا ہے۔''

''اوہ۔۔۔۔۔۔فی الحال یہ شوق فرمائیے''

اور دیر تک وہ آپ کے سگریٹوں سے شوق فرماتا رہے گا۔

تیسری قسم

زید آپ کا دوست ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ وہ مفت نوش ہے ہر روز وہ آپ کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہے اور بڑے پر تکلف انداز میں کہتا ہے ''لاؤ بھئی اب سگریٹ پلاؤ''

چوتھی قسم

آپ کسی باغ میں بینچ پر بیٹھے ہیں۔آپ کے ساتھ ہی ایک اور صاحب بیٹھے کتاب کے مطالعے میں مصروف ہیں۔آپ جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالتے ہیں۔آپ کے پاس بیٹھے ہوئے صاحب مفت نوش ہیں،فوراً جیب سے دیا سلائی نکالیں گے اور جلا کر آپ کی طرف بڑھا دیں گے۔آپ ان کا شکریہ ادا کریں گے اور سگریٹ کی ڈبیہ ان کی طرف بڑھا دیں گے۔

''شوق فرمائیے''

وہ بھی آپ کا شکریہ ادا کریں گے

پانچویں قسم

بکر سے آپ کی ملاقات گاہے گاہے ہوتی ہے اس لیے آپ کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مفت نوش ہے۔ جب آپ سے ملے گا اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالے گا اور آپ کو پیش کرے گا آپ پیکٹ کھولیں گے مگر وہ خالی ہو گا۔ بکر مناسب و موزوں الفاظ میں اپنی خفت کا اظہار کر دے گا۔ آپ جیب سے اپنا پیکٹ نکالیں گے اور اس کو پیش کر دیں گے۔

چھٹی قسم

مفت نوشوں کی وہ قسم ہے جو صرف خاص قسم کے سگریٹ پیتے ہیں جونہی وہ کسی دوست یا معمولی جان پہچان کے ہاتھ میں پانچ پانچ پانچ یا کریون اے کا ڈبہ دیکھیں گے تو خوشی کا نعرہ بلند کر کے کہیں گے "زندہ باد---------یہ ہے سگریٹ پینے کے لائق۔"

ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر وہ چھ سات اپنی جیب میں ڈال لیں گے "معاف فرمائیے گا۔ ایک سے میرے ذوق کی تسکین نہیں ہو گی۔"

ساتویں قسم

ذرا جارحانہ قسم کی ہے آپ اپنے دوستوں کے ساتھ وائی ایم سی اے ہال کے باہر فٹ پاتھ پر کھڑے ہیں۔ سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر انگلیوں میں تھامتے ہیں۔ دیا سلائی سلگانے ہی کو ہیں کہ ایک راہ چلتا جلدی سے آپ کے پاس آتا ہے انگلیوں میں سے سگریٹ نکال لیتا ہے۔ دیا سلائی طلب کرتا ہے اور سگریٹ سلگا کر یہ جا وہ جا۔ آپ سمجھتے ہیں، پاگل تھا، چنانچہ دیر تک یہ عجیب و غریب حادثہ آپ کے اور آپ کے دوستوں کا موضوع سخن بنا رہتا ہے۔

آٹھویں قسم

بڑی ڈھیٹ قسم ہے آپ تنگ آ کر کہتے ہیں ''بھئی اپنی جیب سے کیوں نہیں پیتے؟''

جواب ملتا ہے ''میں قسم کھا چکا ہوں کہ اپنی جیب سے کبھی ایک سگریٹ بھی نہیں خریدوں گا مفت کے مال کا کچھ اور ہی مزا ہے''

نویں قسم

آٹھویں قسم سے کچھ مختلف ہے آپ تنگ آ کر پوچھتے ہیں ''بھئی تم اپنی جیب سے کیوں نہیں پیتے؟''

جواب ملے گا ''ڈاکٹر نے مجھ سے کہا ہے کہ سگریٹ میرے لیے بہت ہی مضر ہے۔ اپنی جیب میں سگریٹ پڑے ہوں تو مجھ سے کنٹرول نہیں ہوتا اس لیے کبھی

کبھار دوستوں سے مانگ کر پی لیتا ہوں۔"

دسویں قسم

قصیدہ گو مفت نوشوں کی ہے" بھئی خدا کی قسم! منٹو بادشاہ ہے سگریٹوں کا دنیا بھر میں آپ کو اچھا سگریٹ نہ ملتا ہو لیکن منٹو کے پاس ضرور ہو گا۔۔۔۔لاؤ دوست! دیکھیں آج کل کیا پیتے ہو؟"

"بہت ہی معمولی برانڈ ہے کیپسٹن"

"تم اور کیپسٹن پیو، ضرور اس میں بھی کوئی بات ہو گی۔۔۔۔۔۔لاؤ دیکھیں"

گیارھویں قسم

ایک دو سگریٹوں پر نہیں پورے ڈبے پر حملہ آور ہوتی ہے" بھئی معاف کرنا میں تمہارا ڈبہ لیے جا رہا ہوں میرا دندان ساز کے یہاں رہ گیا ہے" یا" دو ڈبے مجھے دے دو، میرے پاس کل یا پرسوں تک آنے والے ہیں، لوٹا دوں گا"

بارہویں قسم

وہ ہے جس کو دیکھتے ہی لوگ اپنے اپنے سگریٹ زور سے تھام لیتے ہیں یا پھر اپنا بھرا پیکٹ خالی ظاہر کر کے پھینک دیتے ہیں۔

تیرہویں قسم

وہ ہے جو تھوڑی دیر آپ سے باتیں کریں گے اور رخصت ہوتے وقت زمین پر سے آپ کا پھینکا ہوا پیکٹ یہ کہہ کر اٹھا لیں گے ”بچے کے لیے لے جاتا ہوں اسے خالی ڈبیوں سے کھیلنے کا بہت شوق ہے۔“

☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

پٹاخے

ایک خبر

پاکستان میں بچوں کو آتش بازی کی لعنت سے بچانے کے لیے حال ہی میں ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کا نام ''انجمن انسداد پٹاخہ جات'' ہے اس کا صدر دفتر بارود خانہ میں قائم کیا ہے امید کی جاتی ہے کہ بہت جلد اس کی شاخیں روس، امریکہ اور انگلستان میں بھی قائم کر دی جائیں گی۔

دوسری خبر

اس سال آتش بازی سے جل کر مرنے والے بچوں کی تعداد پچھلے سال سے دو گنا بتائی جاتی ہے۔ پاکستانی والدین نے اس پر بہت تشویش کا اظہار کیا ہے او رحکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ آتش بازی سے جل کر مرنے والے بچوں کی ایک سالانہ تعداد مقرر کر دے۔ حکومت سے اسی سلسلے میں چنانچہ ایک نئی وزارت قائم کرنے کی استدعا بھی کی گئی ہے اس وزارت کا عہدہ سنبھالے والے وزیر پٹاخہ کہلائیں گے۔ سنا ہے کہ مشرقی پنجاب کے دو بہت بڑے مہاجر آتش بازوں میں یہ وزارت حاصل کرنے کے لیے جوڑ توڑ ہوں گے۔

ایک مکالمہ

ایک باپ: آتش بازی چلانا ٹھیک نہیں

ایک بچہ: کیوں؟

باپ: پیسہ ضائع ہوتا ہے

بچہ: اتنی بڑی بڑی لڑائیاں لڑی جاتی ہیں کیا ان میں پیشہ ضائع نہیں ہوتا

دوسرا مکالمہ

ایک بچہ: میں آتش بازی نہیں چلاؤں گا

ایک باپ: کیوں؟

بچہ: میں بہت برخوردار ہوں

باپ: کیا کہا؟ چلو ڈاکٹر کے پاس، ضرور تمہارا دماغ خرب ہو گیا ہے۔

ایک سبق

سردیوں میں مولی نہ کھاؤ اور عید شب رات پر آتش بازی نہ چلاؤ

دوسرا سبق

گرمیوں میں مولی کھاؤ اور عید شب برات چھوڑ کر ہر روز آتش بازی چلاؤ۔

ایک تحقیق

نفسیات کے ماہرین بڑی تحقیق وتدقیق کے بعد اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ خوشی کا پر جوش مظاہرہ کرنے کے لیے پٹاخے چھوڑنا اور آتش بازی چلانا انسان کی جبلت ہے۔ بیس ہزار سال قبل از مسیح کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلا پٹاخہ ایک انسان کی کھوپڑی کا چلایا گیا تھا لیکن آہستہ آہستہ جب لوگوں کو احساس ہوا کہ ایسا پٹاخہ چلانے سے ایک انسان کم ہو جاتا ہے تو دوسرے پٹاخے ایجاد ہونے شروع ہوئے۔

دوسری تحقیق

نفسیات کے ماہرین تحقیق وتدقیس کے بعد اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ شروع شروع میں انسان نے درندوں کو ڈرانے کے لیے پٹاخے اور آتش بازیاں ایجاد کی تھیں لیکن بعد میں جب انسان درندوں کا بھیس بدلنے لگا تو یہ پٹاخے اور آتش بازیاں گولوں اور بموں کی شکل اختیار کر گئیں۔

ایک فرمائش

ایک بچہ: ابا جی! مجھے یہ پٹاخہ نہیں چاہیے

ایک باپ: کیوں؟

بچہ: بڑے زور سے پھٹتا ہے میں ڈر جاتا ہوں، کوئی ایسا پٹاخہ لا دیجئے جو زور سے نہ پھٹے۔

دوسری فرمائش

ایک بچہ: ابا جی! ایٹم بم کیا ہوتا ہے؟

ایک باپ: دنیا کا سب سے بڑا پٹاخہ

بچہ: مجھے ایک لا دیجئے شب برات پر چلاؤں گا

ایک سایہ

ایک آدمی اپنے کم سن بچے کو ساتھ لے کر ایک فقیر کے پاس گیا اور کہنے لگا ''پیر و مرشد میں شاہ عالمی کے پاس رہتا ہوں یہ میرا بچہ ہے خدا معلوم اسے کیا وہ گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جنات کا سایہ ہے پٹاخے کی آواز سن کر ہی اس پر تشنج کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔''

دوسرا سایہ

ایک آدمی اپنے کم سن بچے کو ساتھ لے کر ایک فقیر کے پاس گیا اور کہنے لگا ''پیر و مرشد۔۔۔۔۔ میں مہاجر ہوں امرتسر سے آیا ہوں۔ میرے اس بچے کے لیے کوئی تعویذ دیجئے۔ جب بھی اسے موقع ملتا ہے۔ ادھر ادھر سے چیزیں اکٹھی کرتا

ہے اور انہیں آگ لگا دیتا ہے۔"

پہلی پھلجڑی

ایک بچہ: انار کلی میں ایک لڑکی جا رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر ایک آدمی نے اپنے دوست سے کہا "بالکل پٹاخہ ہے"

دوسرا بچہ: کیا وہ چلا؟

پہلا بچہ: ہاں۔۔۔۔۔۔اس لڑکی نے جوتا اتارا اور پٹاخ سے اس آدمی کے سر جڑ دیا۔

دوسری پھلجڑی

ایک بچہ: آتش بازی چلانے سے ہمیں کیوں منع کیا جاتا ہے؟

دوسرا بچہ: اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

پہلا بچہ: گدھے کہیں کے ریڈیو پر، اخباروں میں، تقریروں میں ہر روز یہی بکواس کرتے ہیں کہ بچوں کو آتش بازی کی لعنت سے دور رکھا جائے لیکن دکانیں بھری ہوئی ہیں آتش بازیوں سے۔۔۔۔۔کیوں نہیں ایسا کرتے کہ آتش بازی بنانا ہی بند کر دیں۔

دوسرا بچہ: ش ش ش۔۔۔۔۔کوئی سن لے گا۔

☆☆☆☆☆☆

کارل مارکس

آں کلیم بے تجلی آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن دربغل دارد کتاب
(اقبال)

تمام دنیا کی نگاہیں آج کل روس پر جمی رہتی ہیں۔آج سے پہلے بھی جمی رہتی تھیں مگران نگاہوں میں تمسخر کی ایک جھلک تھی۔ایک قسم کا استہزا تھا۔یورپ میں سیاست کی ٹیڑھی ٹوپی پہننے والے بانکے، روس کے مزدوروں کی جدوجہد دیکھتے تھے اور زیرلب مسکراتے تھے۔۔۔۔۔روس میں صدیوں کے غلاموں نے جب اپنی زنجیروں کا لوہا گلا گلا کر ایک نئی سلطنت کی بنیادوں کو پلانا شروع کیا تو آزاد قوموں نے کئی بار ان کا مضحکہ اڑایا۔۔۔اپنا گھر درست کرنے کے لیے جب ان لوگوں نے گرم جوشی کا اظہار کیا تو بنے بنائے اور سجے سجائے گھروں میں رہنے والے کھلکھلا کر ہنستے رہے۔وہ کوشش جو کبھی دیوانگی پر محمول کی جاتی تھی۔وہ سعی جو کبھی ناممکن اور بےثمر یقین کی جاتی تھی۔۔۔۔۔۔۔وہ سلطنت جو کبھی مزدوروں کا ایک خیال خام سمجھی جاتی تھی۔معرض وجود میں آئی۔۔۔۔۔۔۔۔سیاست کی ٹیڑھی ٹوپی پہننے والوں، مذہب کا لمبا جبہ زیب تن کرنے والوں، آزاد اور غلام قوموں شکستہ جھونپڑوں اور مرمریں محلوں میں رہنے والوں نے دیکھا۔۔۔۔۔وہ معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کو ''سوویٹ روس'' کہتے ہیں۔

سوویٹ روس اب خواب نہیں خیال خام نہیں دیوانہ پن نہیں۔۔۔۔۔ایک

ٹھوس حقیقت ہے۔۔۔۔۔وہ ٹھوس حقیقت جو ہٹلر کے فولادی ارادوں سے کئی ہزار میل لمبے جنگی میدانوں میں ٹکرائی اور جس نے فاشیت۔۔۔۔۔آہن پوش فاشیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔۔۔۔وہ اشتراکیت جو کبھی سرپھرے لونڈوں کا کھیل سمجھا جاتا تھا۔ وہ اشتراکیت جو کبھی دل بہلاوے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔۔۔۔۔وہی اشتراکیت جو ننگ دین اور ننگ انسانیت یقین کی جاتی تھی۔آج روس کی وسیع وعریض میدانوں میں بیمار انسانیت کے لیے امید کی ایک کرن بن کر چمک رہی ہے۔یہ وہی اشتراکیت ہے جس کا نقشہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کارل مارکس نے تیار کیا۔۔۔۔۔قابل احترام ہے یہ انسان جس نے اپنی ذات کے لیے نہیں، اپنی قوم کے لیے نہیں، اپنے ملک کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے، ساری انسانیت کے لیے، مساوات اور اخوت کا ایک ذریعہ تلاش کیا۔

جس طرح کیچڑ میں کنول پیدا ہوتا ہے اسی طرح سرمایہ پرست یہودیوں کے ایک گھرانے میں سرمایہ شکن کارل مارکس پیدا ہوا۔۔۔۔۔۔۔پانچ مئی سن اٹھارہ سو اٹھارہ کو۔۔۔۔ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے متعلق باپ نے یہ رائے قائم کی کہ یہ بڑا ہو کر شیطان نکلے گا۔۔۔۔۔۔۔کارل مارکس بڑا ہو کر شیطان نکلا یا فرشتہ اس کا کچھ اندازہ تو ہماری موجودہ نسلیں کر چکی ہیں قطعی فیصلہ آنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہے۔۔۔۔اس مختصر فیچر میں جواب آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ہم اس شیطان یا فرشتے کے مختصر سوانح حیات نیم سوانح حیات نیم ڈرامائی شکل میں پیش کریں گے۔

باپ: خدا ہمارے حال پر رحم کرے۔۔۔۔۔تمہارے اس لڑکے نے میرا

نام میں دم کر رکھا ہے۔

ماں: جیسا میرا ہے ویسا آپ کا ہے یہ آپ ہر وقت مجھے ہی کیوں طعنے دیتے رہتے ہیں۔

باپ: بھئی! میں بڑا پریشان ہو گیا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔۔۔۔۔غبی ہوتا، کند ذہن ہوتا تو میں خاموش ہو کے بیٹھ جاتا مگر کم بخت ذہین ہے۔۔۔۔۔بلا کا ذہین ہے۔چاہے تو سب کچھ سیکھ سکتا ہے۔

ماں: مگر اس کا دل بھی کسی طرف لگے؟

باپ: اسی بات کا تو رونا ہے سکول میں بھی اس کے یہی چلن تھے۔اب کالج میں داخل ہو کر تو اور بھی زیادہ آوارہ گرد ہو گیا ہے۔تعلیم کی طرف دھیان ہی نہیں دیتا۔بڑی بے فکری اور بے پرواہی سے یہ زمانہ جو اس کی زندگی میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے، گزار رہا ہے۔ ہزار بار سمجھا چکا ہوں مگر صاحبزادے کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔۔۔۔۔۔وہ خاص مضمون یعنی قانون جو میں نے اس کے لیے منتخب کیا تھا۔اس کی طرف سنتا ہوں، کچھ توجہ ہی نہیں دیتا۔ میں اس کا یہ لاابالی پن کب تک برداشت کرتا رہوں گا۔صبر کی ایک حد ہوتی ہے

ماں: تازہ خط میں اس نے آپ کو کیا لکھا ہے؟

باپ: (تمسخر کے ساتھ) ذہنی الجھنوں اور روحانی پریشانیوں کے باعث آپ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لیے کچھ دن ہسپتال میں رہے۔وہاں سے واپس آ کر بھی جب آپ کی روحانی کشمکش ختم نہ ہوئی تو مجھے لکھتے ہیں'' ابا جی! میرے ذہن میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔اس انقلاب کی پوری

تفصیل حاضر خدمت ہو کر ہی عرض کر سکتا ہوں۔ اجازت عنایت ہوتا کہ میں اپنی روح کا بوجھ ہلکا کر سکوں''۔۔۔۔۔۔۔۔یہ لکھا ہے آپ نے۔۔۔۔۔(ہنستا ہے) اپنی روح کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے برخوردار یہاں آنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے اجازت مانگتے ہیں۔

ماں: یہ روح کا بوجھ کیا ہو سکتا ہے؟

باپ: کوئی نیا عشق لڑایا ہو گیا آپ نے یا وہی پرانا ہو گا اور ہسپتال میں جا کر عود کر آیا ہو گا۔

ماں: سچ مچ یہ اس کو کیا خبط سمایا جو اس جینی سے عمر میں اس سے چار سال بڑی ہے۔ شادی کرنے پر تلا ہوا ہے۔

باپ: اسی کو تو روحانی بیماری کہتے ہیں چونکہ اس کا علاج ہسپتال میں نہیں ہو سکا۔ اس لیے یہاں تشریف لانا چاہتے ہیں جیسے میں اجازت دے دوں گا کہ جاؤ میاں اپنے سے دگنی عمر کی لڑکی سے شادی کر لو۔

ماں: مگر آپ تو اسے جینی سے شادی کرنے کی اجازت دے چکے ہیں

باپ: یہ جھک میں نے صرف اس لیے ماری تھی کہ وہ جینی سے خط و کتاب کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس نے کالج کا پہلا سال شعر و شاعری میں گزارا ہے۔ تین کاپیوں میں ڈیڑھ ہزار شعر دیکھ چکا ہوں جو اس نے اس ناشدنی جینی کے نام سے منسوب کیے ہیں۔ میں نے اس کو اجازت دی تھی تا کہ یہ عشقیہ شعر و شاعری اور خط و کتاب کا خاتمہ ہو جائے مگر اب میں سمجھتا ہوں کہ وہ نئی مراعات چاہتا ہے۔

ماں: آپ نے خط کا جواب لکھ دیا

باپ: ہاں لکھ دیا لو تم بھی سن لو ــــــــ (خط پڑھتا ہے) ــــــــ ''خدا تمہارے حال پر رحم کرے ــــــــ تم دلجمعی سے بالکل کام نہیں لیتے اور علم کے مختلف شعبوں میں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہو۔ بے ربط غور و فکر ہمیشہ بے نتیجہ رہتا ہے۔ بے ربط علمی مشاغل سے وقت اسی طرح ذبح ہوتا ہے جس طرح بادہ و ساغر سے ــــــ والدین کی خوشنودی کی طرف تم نے کبھی توجہ نہیں دی اس لیے کہ تم اسے بالکل مہمل سمجھتے ہو۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھتا ہوں جینی کے محبت بھرے خطوط اور ایک نیک نیت اور شفیق باپ کی چھٹیوں سے تم اپنا پائپ سلگاتے ہو گے۔ خیر یہ بھی برا نہیں کیوں کہ اس طرح یہ خطوط غیر لوگوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے تو بچ جائیں گے کیوں کہ تمہارے پھوہڑپن سے تو یہی امید ہے کہ جلائے نہ جائیں گے تو دوسروں تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ اگرچہ امیر سے امیر لڑکا بھی کالج میں پانسو تھیلر خرچ کرتا ہے لیکن تم ایسے ہو کہ سات سو تھیلر چٹ کر جاتے ہو اور ڈکار تک نہیں لیتے۔ تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ میں سونے کا بنا ہوں۔ گھر آنا فضول ہے اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری نزدیک کالج کے لیکچروں کی کوئی اہمیت نہیں لیکن کلاس میں جو تم رسمی طور پر چلے جاتے ہو۔ اگر یہی جاری رہے تو غنیمت ہے۔''

باپ کے اس خط کا یہ اثر ہوا کہ ایسٹر کی چھٹیوں میں کارل مارکس کالج ہی میں رہا۔ ماں کو رنج ہوا لیکن باپ خوش تھا مارکس کی خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی کہ اس کے والدین تھوڑے ہی عرصے کے بعد بیمار پڑے اور 10 مئی 1938ء کو فوت ہو

گئے۔ والد کی وفات کے بعد مارکس کی تعلیم بصد خرابی جاری رہی۔ آخر کار ایک فلسفیانہ مضمون لکھنے پر اسے ''جینا یونیورسٹی'' سے پی ایچ ڈی کی سند مل گئی۔ چونکہ مارکس کے عقیدے کے بموجب علم و عمل ایک ہی شے کے دو رخ تھے۔ اس لیے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اس نے فوراً سیاسی میدان میں جدوجہد شروع کر دی۔ زیٹانگ نامی ایک اخبار کا مدیر بنا اور حکومت کی پالیسی پر اس شدت سے تنقید کی کہ اخبار ضبط کر لیا گیا۔

مارکس: روگی! میرے دوست ضبطی کے اس حکم پر مجھے قطعاً تعجب نہیں ہوا افسوس بھی کچھ زیادہ نہیں ہوا

روگی: کیوں؟

مارکس: ضبطی کا حکم اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ عوام میں سیاسی بیداری بڑھ رہی ہے۔ جب کسی قوم میں سیاسی بیداری کے آثار پیدا ہونے لگیں تو تحریر و تقریر پر اسی طرح پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے ''زیٹانگ'' بند ہونے پر سنسر افسر نے کیا لکھا تھا؟

روگی: کیا لکھا تھا؟

مارکس: میں خوش ہوں کہ مارکس کے دست بردار ہو جانے کا یہ اثر ہوا ہے کہ آج میں نے اپنا تمام کام ایک چوتھائی وقت میں ختم کر لیا۔

روگی: تم نے ادارت سے استعفیٰ کیوں دیا؟

مارکس: اور کیا کرتا بھائی ایسے ماحول میں جہاں قدم قدم پر غلامی ہو مجھ سے کام نہیں ہو سکتا میرا دل گھٹنے لگتا ہے آزادی کے لیے سوئیوں سے لڑنا مجھے پسند

نہیں۔ میں حاکم طبقے کی بے رحمی اور بے وقوفی اور اپنے ہم عصروں کی جی حضوری چاپلوسی بہانہ سازی اور بے کار کے بحث مباحثے سے تنگ آ گیا ہوں جرمنی میں رہ کر میں کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔خدا کی قسم! کچھ نہیں کر سکتا، اس ملک میں رہنا اپنی توہین ہے، ذلت ہے۔

روگی: تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

مارکس: سوچ رہا ہوں کہ کوئی رستہ نکل آئے آج کل مفت کی پریشانی اور خواہ مخواہ کی بحثوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ ادھر میرے کنبے والے بے کار میری شادی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ کوئی انہیں سمجھائے تو کیسے سمجھائے؟۔۔۔۔۔۔عشقیہ جذبات برطرف میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اپنی ہونے والی بیوی سے بے پناہ محبت ہے آج منگنی ہوئے سات برس ہو چکے ہیں۔ وہ بے چاری اپنے اور میرے عزیزوں کو راضی کرنے کی کوشش کر رہی ہے مگر وہ ایسے خرد ماغ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

روگی: جینی کے رشتہ دار اس شادی کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

مارکس: تم یہ بھی نہیں سمجھتے بھائی! وہ لوگ برلن کی حکومت کی اسی قدر عزت کرتے ہیں جتنی اپنے آسمانی باپ کی اور میں حکومت کا بیری بہت بڑا دشمن ٹھہرا اس ڈھونگ کا رہے میرے عزیز تو وہ بھی اپنے انفرادی مفاد کے پیش نظر اس رشتے کے خلاف ہیں۔ کئی برسوں سے میں اور جینی اس شادی کے معاملے میں اپنے سے تگنی عمر والوں سے بحث کر رہے ہیں لیکن بڈھوں کی اس دلیل کا کیا کیا جائے جو وہ ہر بات میں سامنے لے آتے ہیں

''یہ ہماری زندگی کا تجربہ ہے جب تم ہماری عمر کو پہنچو گے، اس وقت سمجھو گے''

اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کی عمر تک پہنچ کر جینی سے شادی کروں۔

روگی: میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے ایک اخبار جاری کروں۔ اگر یہ سکیم پوری ہوگئی تو میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری بہت سی مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا

مارکس کے دوست روگی کی سکیم نے عملی جامہ پہن لیا اس نے ایک اور اخبار نکالا اور مارکس کو پانسو تھیلر ماہانہ پر اس کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ فکر معاش سے آزادی ہوئی تو مارکس نے انیس جولائی اٹھارہ سو تینتالیس میں جینی سے شادی کر لی اور پیرس چلا گیا۔ یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ مارکس نے دن گزارنے کے لیے ایک اخبار کے ادارے میں کام کرنا شروع کر دیا یہاں اس کی ملاقات مشہور شاعر ہائنے سے ہوئی۔ ہائنے اگرچہ جرمن تھا لیکن فرانسیسی اس کو اپنا قومی شاعر مانتے تھے جب شاعر نے پروشا کی حکومت کے ظلم وستم کے خلاف متواتر گیارہ نظمیں شائع کرائیں تو حکومت پروشا نے فرانس پر اثر ڈال کر اخبار کے مدیروں کے خلاف جن میں ما کر بھی شامل تھا، جلا وطنی کا حکم صادر کرا دیا۔ مارکس اپنی بیوی سمیت بروسلز چلا گیا۔

بیوی: اب یہاں گزارے کی کیا صورت ہوگی یہ لوگ ہمیں کہیں بھی چین نہیں لینے دیتے۔

مارکس: کچھ فکر نہ کرو اللہ میاں نے بندوبست کر دیا ہے۔۔۔۔۔ دیکھو، ابھی میرے شفیق دوست فریڈرک اینجلز کا خط آیا ہے

بیوی: (خوش ہوکر) کیا لکھتے ہے

مارکس: (خط کھولتا ہے) چندہ جمع کر کے اس نے کچھ روپیہ بھیجا ہے معلوم نہیں کتنا، آج یا کل مل جائے گا۔۔۔۔۔۔۔ہاں تو خط میں لکھتا ہے۔۔۔۔۔۔"معلوم نہیں یہ رقم بروسلز میں تمہارے گزارے کے لیے کافی بھی ہوگی یا نہیں لیکن تم کچھ فکر نہ کرو میری انگریزی تصنیف کا جو معاوضہ بھی ملے گا میں تمہیں فوراً روانہ کر دوں گا مجھے خرچ کی مطلق ضرورت نہیں اور اگر ہوئی بھی تو یہاں سے روپیہ ملتا رہے گا دراصل میں نہیں چاہتا کہ تمہارے دشمن اس بات سے خوش ہوں کہ مالی مشکلات سے تمہیں پریشانی ہوئی۔"

بیوی: خدا آپ کے اس مشفق دوست کو رہتی دنیا تک سلامت رکھے آپ کی کتنی خبر گیری کرتا ہے۔

مارکس: بیگم! اینجلز کو صرف میرا دوست کہنا اس کی اور میری دونوں کی توہین ہے۔ہم دونوں ایک ہیں ہماری زندگی ایک دوسرے سے اس درجہ وابستہ ہو چکی ہے کہ ہم دونوں روحانی طور پر ایک ہو چکے ہیں اینجلز میرا اور میں اس کا ہمراز ہوں۔

بیوی: ان سے آپ کی ملاقات شاید زیٹانگ اخبار کے دفتر میں ہوئی تھی؟

مارکس: تم ٹھیک کہتی ہو لیکن ہماری دوستی کا آغاز اس وقت ہوا جب اینجلز نے اپنی کتاب لکھی اور میں نے اس کی بہت تعریف کی سچ تو یہ ہے کہ اقتصادی میدان میں اینجلز کی نظر بہت وسیع ہے حالانکہ وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ مارکس بہ نسبت میرے زیادہ دور۔زیادہ گہرا اور زیادہ جلدی دیکھتا ہے۔یہ اس کی کسر نفسی ہے۔

اینجلز اور مارکس کی زندگی واقعی ایک دوسرے سے غایت درجہ وابستہ تھی۔

باوجود انجلز کی کسی نفسی کے یہ ماننا پڑتا ہے اور جیسا کہ خود مارکس تسلیم کرتا ہے ابتداء میں اقتصادی میدان انجلز نے دیا اور کارل مارکس نے لیا۔ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ خیر، بروسلز اس زمانے میں بے الاقوامی بورژوائی رجحانات کا مرکز تھا اور اس لیے کمیونزم کی نشر و اشاعت کے لیے بہترین جگہ تھی۔ یہاں مارکس نے اپنا کام شروع ہی کیا تھا کہ 24 فروری 1848ء کو فرانس میں انقلاب ہو گیا بادشاہ فرانس کو جو حادثات پیش آئے۔ انہوں نے یورپ کے تاجداروں کو ڈرا دیا۔ چنانچہ بیلجیم کے بادشاہ کے حکم سے مارکس اور اس کی بیوی کو گرفتار کر لیا گیا۔ دوسرے دن رہائی ملی تو جلاوطنی کا حکم صادر ہو گیا۔ مارکس نے پھر پیرس کا رخ کیا اور اپنے چند انقلابی دوستوں کی مدد سے اخبار نکالا جس سے اس کی شہرت عام ہو گئی مگر اس طوفان میں یہ چراغ کب تک روشن رہ سکتا ہے۔ فوراً ہی حکومت کا تشدد شروع ہو گیا۔ اخبار کے حصہ داروں نے ڈر کے مارے مالی امداد سے انکار کر دیا لیکن ان مشکلات کے باوجود مارکس نے اخبار بند نہ کیا۔ باپ سے ترکے میں جو سات ہزار تھیلر ملے تھے۔ اس پر نمبر لگا دیئے لیکن دو چار دن ہی میں اخراج کا حکم آ گیا 19 مئی کو مارکس نے آخری انقلاب نمبر نکالا اور اخبار بند کر دیا۔

مارکس: ہمیں ستانے کے لیے حکومت بہانے کیوں تراشتی ہے۔ جھوٹ اور افترا کے پل کیوں باندھتی ہے۔ ہم تو خود جلاد ہیں اس لیے دوسروں سے رحم کی امید نہیں رکھتے جب ہمارے دن پھریں گے تو ہم اپنے تشدد کے بہانے اور حیلے نہیں تراشیں گے۔

دوست: اخبار بند ہونا تھا سو گیا، اب آپ کا ارادہ کیا ہے؟

مارکس: ارادہ کیا ہے۔ دماغ مختل ہے ہوش وحواس قائم نہیں۔قرض خواہوں سے چھٹکارا ملے تو کچھ سوچوں بھی مزدوروں اور کلرکوں کی تنخواہیں ادا کرتے کرتے میرا کچومر نکل گیا ہے۔ بیوی کے پاس کچھ زیور رہ گئے تھے۔ان کو گروی رکھ کر اتنے دن گزارہ کیا ہے۔ایک دوست کو مالی امداد کے لیے لکھا ہے۔اس نے چند جمع کرنا شروع کر دیا۔

دوست: تو کیا ہوا روپیہ کسی طرح تو آنا چاہیے۔

مارکس: نہیں بھائی! مجھے یہ طریقہ منظور نہیں میں ہر عسرت برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن عوام سے بھیک مانگنا کسی طرح بھی گوارا نہیں ہوسکتا۔ جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ وہ میری خاطر چندہ جمع کر رہا ہے تو خدا کی قسم! مجھے بہت دکھ ہوا میں نے فوراً لکھا کہ ایسی امداد مجھے نہیں چاہیے۔ میں نے اس سے مانگا تھا۔ دوسروں سے مانگنے کے لیے نہیں کہا تھا۔

دوست: کیا پیرس میں رہنے کا ارادہ ہے؟

مارکس: نہیں مطلق نہیں جونہی زادراہ کا بندوبست ہوا میں یہاں سے لندن چلا جاؤں گا

23 اگست کو مارکس نے فرانس کو الوداع کہی اور لندن چلا آیا۔ یہاں اس کے لڑکا پیدا ہوا جو مفلسی کے باعث ایک سال کے اندر اندر مر گیا۔ چاروں طرف مصائب ہی مصائب تھے لیکن ان کی موجودگی میں بھی مارکس نے اپنے علمی مشاغل جاری رکھے۔صبح نو بجے لندن کی لائبریری میں چلا جاتا تھا اور شام کے سات بجے لوٹتا تھا۔۔۔وہ اپنی مشہور کتاب ''اقتصادیات پر تنقید'' لکھ رہا تھا،

اس زمانے میں تقدیر کچھ مسکرائی تو ایک دوست کے توسط سے امریکہ کے ایک اخبار کی رپورٹری مل گئی اور کچھ معاوضی ملنے لگا تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مارکس سخت بیمار ہوا۔

مارکس: کسی بیماری نے مجھے اتنا کمزور نہیں کیا جتنا کہ اس نامراد بیماری نے کیا ہے مرتا مرتا بچا ہوں۔

دوست: اب آپ کے حالات کیسے ہیں؟

مارکس: (مسکرا کر) حالات اب ایسی تسلی بخش منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ نہ باہر جا سکتا ہوں کیوں کہ سب کپڑے گروی پڑے ہیں۔ نہ گوشت کھا سکتا ہوں کیوں کہ جو رہی سہی ساکھ تھی، وہ اس بیماری نے ختم کر دی ہے۔

دوست: چھوٹی لڑکی کا کیا حال ہے؟

مارکس: بے چاری کئی دن سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے بہت کمزور ہو گئی ہے شاید ہی بچے کیوں کہ دوا دارو کے لیے ایک پیسہ بھی پاس نہیں۔

دوست: اللہ رحم کرے

مارکس: ہاں اللہ ہی رحم کرے۔۔۔۔۔۔بیوی بیمار، بیٹی بیمار، لڑکے کو بخار، روپیہ پیسہ پاس نہیں ہفتے بھر سے صرف روٹی اور آلو پر گزارا کر رہا ہوں۔ شاید اب یہ بھی نہ ملے اور فاقے کرنے پڑیں۔ کاغذ خریدنے کے لیے پیسے نہیں کہ مضمون لکھ کر اخبار کو روانہ کر سکوں۔ اب صرف یہ ہونا باقی ہے کہ مالک مکان گھر سے نکال دے کیوں کہ اس کے بائیس پونڈ میری طرف نکلتے ہیں۔

دوست: اگر اس نے واقعی نکال دیا؟

مارکس: تو بہت ہی اچھا ہوگا ان بائیس پونڈوں کا بوجھ تو میرے سینے سے اترے گا۔۔۔۔لیکن مالک مکان یہ عنایت مجھ پر کیوں کرنے لگا۔ روٹی والے، دودھ والے، سبزی والے، قصائی، پرچون والے، ان سب کا قرضہ الگ رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مصیبتیں کب ختم ہوں گی۔ بڑے شرم کی بات ہے مگر چند روز سے مزدوروں سے قرض لے لے کر گزارا کر رہا ہوں۔ کیا کروں، ان سے بھی نہ مانگوں تو بھوکا مر جاؤں۔

دوست: آپ ہی کی ہمت ہے کہ مشکلات کے ان ہجوم میں بھی اپنا کام کئے جا رہے ہو۔

مارکس: بورژوائی طبقہ مجھے میرے مقصد سے ہٹا کر سونا کمانے کی ترغیب دینا چاہتا ہے میں ان کو بتا چکا ہوں کہ وہ مجھے کبھی سکے بنانے کی مشین میں تبدیل نہیں کر سکیں گے۔ میں ہر مصیبت میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔

دوست: مگر روپیہ کمانا بھی تو ضروری ہے

مارکس: روپیہ کمانا چاہیے کہ ہم زندہ رہیں اور کچھ لکھ سکیں لیکن روپیہ کمانے کے لیے ہمیں زندہ رہنا اور لکھنا ہرگز نہیں چاہیے۔

مفلسی کا یہ عالم لیکن اپنے پیش نظر مقصد سے ایک لمحے کے لیے بھی مارکس کی نظر نہ ہٹی وہ ایک بندہ مومن کی طرح اعلان حق میں لگ رہا۔ کڑے سے کڑے امتحانوں میں سے گزرنا پڑا مگر وہ ثابت قدم رہا۔ اس کی جان و دل سے پیاری بچی سامنے دم توڑ رہی تھی۔ خود فاقوں سے نڈھال تھا مگر مجال ہے کہ اس کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لغزش آئی ہو۔

بیوی: (وحشت زدہ ہوکر)۔۔۔۔۔۔۔۔۔ننھی نے دم توڑ دیا۔

مارکس: مرگئی بے چاری؟

بیوی: تین روز تک ظالم موت سے لڑتی رہی۔ ننھی سی جان تھی کب تک مقابلے کرتی۔۔۔۔ مجھ سے تو رویا بھی نہیں جاتا۔ آنکھوں میں آنسو بھی نہیں آتے مجھے کیا ہوگیا ہے؟ کیا واقعی ننھی مرگئی ہے؟ تم جاکے دیکھو، شاید زندہ ہو!

مارکس: فراؤ صبر کرو میری جان! مشیت ایزدی یہی تھی۔ میں یہاں زمین پر بستر کر دیتا ہوں۔ تم لیٹ جاؤ، تمہاری صحت اچھی نہیں اپنی جان ہلکان نہ کرو جو ہونا تھا، سو ہوگیا۔ ہر حالت میں اللہ کا شکر بجالانا چاہیے۔

بیوی: ہائے میری حور کس طرح ٹھنڈی اور ساکت لیٹی ہوئی ہے مجھے یقین نہیں آتا۔۔۔۔۔۔۔ مجھے بالکل یقین نہیں آتا (پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کر دیتی ہے)

مارکس: خدا کا واسطہ ہمت سے کام لو۔ تم اس طرح روؤ گی تو میرا کیا حال ہو گا۔ صبر کرو اتنے دکھ برداشت کیے ہیں ایک یہ بھی سہی۔

بیوی: ماں ہوں کیسے اپنا دل پتھر کرلوں۔۔۔۔۔ میری ننھی۔۔۔۔۔۔!

مارکس: اب اس کے کفن دفن کی کچھ فکر کرنی چاہیے۔ ہمارے پاس تو زہر کھانے کو بھی کچھ نہیں (ٹھنڈی سانس لیتا ہے) بے چاری۔۔۔۔ مر گئی۔۔۔۔۔۔ ہاں تو اب کیا کرنا چاہیے۔۔۔۔۔ (توقف کے بعد) میت اٹھا کر دوسرے کمرے میں رکھ دیتا ہوں اور خود اس جلاوطن فرانسیسی کے پاس جاتا ہوں جو ہمارے پاس پڑوس میں رہتا ہے ایک دو بار اس سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ

بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا تھا۔ضرورت کا اظہار کروں گا تو کفن دفن کے لیے شاید کچھ دے دے۔

بیوی: جب بے چاری پیدا ہوئی تھی۔اس وقت بھی اس کو کوئی گہوارہ نصیب نہ ہوا۔آج رخصت ہو رہی ہے تو تابوت نہیں۔۔۔۔۔۔

ایسے کئی چرکے مارکس نے سہے مگر ثابت قدم رہا۔لندن کے دوران قیام میں کچھ سکون پیدا ہونا شروع ہوا تھا کہ اس کا اکلوتا لڑکا فوت ہو گیا۔اس کا داغ مفارقت دے جانا قیامت تھا۔مارکس کو اس سے بہت محبت تھی۔حقیقت یہ ہے کہ اس لڑکے کی وفات پر پہلی بار اس کو محسوس ہوا کہ صدمہ کیا ہوتا ہے۔اس حادثے کے بارے میں اس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا اور کہا 'جیگو کہتا ہے کہ دنیا میں جو واقعی بڑے آدمی ہوتے ہیں۔وہ حقیقت کی جستجو اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ کوئی ذاتی نقصان یا صدمہ انہیں برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔مجھے افسوس ہے کہ میں اس قسم کا بڑا آدمی نہیں لوں لڑکے کی موت نے میری روح اور میرے جسم کو ہلا دیا ہے'' جسم اور روح متزلزل ہونے کے باوجود اس نے اپنی تصنیف کا کام جاری رکھا۔وہ ایک بہت بڑی حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔اس کا دل سیاسی ہنگاموں سے اکتا گیا تھا۔وہ اپنے اقتصادی نظریات کو کتابی صورت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔۔یہ کتاب مکمل ہوئی تو مارکس کی مفلسی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔اکیس جنوری سن اٹھارہ سو انسٹھ کو'' اقتصادیات پر تنقید'' کا مسودہ بالکل تیار تھا مگر۔۔۔۔

مارکس: امریکہ کے اقتصادی آشوب کا بہت ہی برا اثر پڑا ہے۔پہلے یہ ٹریبون

اخبار دو مضمون لیت اتھا۔ اب کم بخت ایک ہی لیتا ہے۔

بیوی: وہ روپیہ جو امی جان کے انتقال کے بعد میسر آے اتھا ایک برس کے اندر اندر ہی ختم ہو گیا۔

مارکس: بھئی بے شمار قرضے ادا کرنے تھے آدھا تو ان ہی میں اٹھ گیا ہو گا۔ خیر مگر اب سوچنا یہ ہے کہ اس مسودے کا کیا کیا جائے۔

بیوی: کوئی نہ کوئی چھاپ دے گا آپ کیوں اتنی فکر کرتے ہیں؟

مارکس: فکر اس لیے کرتا ہوں کہ مسودہ بھیجنے کے لیے پیسے کہاں ہیں ٹکٹ بغیر بھیج دوں

بیوی: (ہنستی ہے (میں ٹکٹوں کا بھول ہی گئی تھی

مارکس: ایک ٹکٹ کہیں سے مل گیا تھا۔ سو اینجلز کو خط لکھا ہے اور اس سے کہا ہے کہ بھائی مسودہ روانہ کرنے کے لیے ٹکٹ چاہئیں کچھ روانہ کر دو تا کہ یہ کام اٹکا نہ رہے (ہنستا ہے) حد ہو گئی ہے شاید ہی کوئی ایسا مصنف ہو گا جس نے دولت پر کتاب لکھی ہو اور وہ خود دولت سے محروم رہا ہو۔۔۔۔ اس کتاب کی طباعت کا انتظام ہو جائے تو ارادہ ہے کہ انگریزی ریلوے کمپنی میں ملازم ہو جاؤں۔

بیوی: آپ سے یہ ملازمت نہ ہو سکے گی

مارکس: تو ایک صورت اور ہے وہ یہ کہ اپنے آپ کو دیوالیہ اعلان کر دوں دو لڑکیاں ہیں انہیں تم کسی امیر کے بچوں کو کھلانے کا کام دلوا دو اور ہم تم دونوں کسی ''ورک ہاؤس'' میں چلے جائیں۔

بیوی: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

مارکس: کیا کہہ رہا ہوں ''ورک ہاؤس'' ہم جیسے نادار انسانوں ہی کے لیے بنائے گئے ہیں اور مارکس کی لڑکیوں اور ان کے کھلائیوں میں کیا فرق ہے جو کئی متمول گھرانوں میں نظر آتی ہے۔

''ورک ہاؤس'' میں جانے اور لڑکیوں کو کھلائی بنانے کی نوبت نہ آئی کیوں کہ سن اٹھارہ سو ساٹھ میں اینجلز کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ وصیت کی رو سے وہ اپنے باپ کی فرم کا مالک بن گیا اور اس قابل ہو گیا کہ اپنے دوست مارکس کی زیادہ سے زیادہ مدد دے سکے۔۔۔۔ اس دوران میں مارکس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس نے بھی مارکس کے لیے کچھ چھوڑا۔ غرض یہ کہ مفلسی کا دور تھوڑے ہی عرصہ کے لیے ختم ہوا۔ اب فارغ البالی ہوئی تو اس نے 1864ء میں انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی۔ تمام دنیا کے مزدوروں کی تنظیم آسان کام نہ تھا۔ مارکس کو اس سلسلے میں بہت سر دردی کرنی پڑی۔ چونکہ اس کام میں پڑ کر وہ آمدنی کی طرف سے بالکل غافل ہو گیا تھا۔ اس لیے مفلسی اور بیماری نے اس کے دروازے پر پھر دستک دی۔

بیوی: مجھے آپ کے دوست اینجلز سے پورا پورا اتفاق ہے ان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ کم بخت کتاب ''سرمایہ'' ہی تمام آفتوں کا موجب ہوئی ہے۔

مارکس: مگر اب تو میں اسے ختم کر چکا ہوں مجھے پوری پوری امید ہے کہ سال کے آخر تک میری مالی حالت بہتر ہو جائے گی میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ مجھے دراصل افسوس اس بات کا ہے کہ میری وجہ سے بے چارہ اینجلز بہت پریشان رہا۔ میری خاطر اسے کاروباری دنیا میں بہت تندہی سے کام کرنا پڑا۔ سچ تو یہ ہے بیگم اینجلز امداد نہ کرتا تو یہ کتاب میں کبھی نہ لکھ سکتا۔

بیوی: اب آپ نے پھر ان کو تکلیف دی ہے

مارکس: یقین جانو اگر از حد ضرورت نہ ہوتی تو میں اسے تکلیف نہ دیتا اپنی انگلیاں قلم کر دیتا جنہوں نے اس کو یہ خط لکھا اور امداد چاہی دوسروں کو تکلیف دے کر زندگی کے دن پورے کرتے رہنا واقعی بہت بڑی ذلت ہے لیکن یہ خیال اس ذلت کو دور کر دیتا ہے کہ اینجلز اور میں دونوں ایک کام میں برابر کے شریک ہیں۔

بیوی: آپ نے ایک بار کہا تھا کہ مزدور کی سی طرز رہائش اختیار کر لیں گے۔

مارکس: میں نے اس پر بہت غور کیا تم خود اب میری اس رائے سے اتفاق کرو گی، بالکل مزدوروں کی سی طرز رہائش ہمارے موجودہ حالات میں مصلحت کے خلاف ہے۔۔۔۔۔ اگر دو جوان لڑکیوں کی بجائے دو لڑکے ہوتے تو بخدا مجھے ایسی رہائش اختیار کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوتا۔

بیوی: آپ کی صحت بہت خراب ہو گئی ہے

مارکس: نہیں تو

بیوی: نہیں تو کیا۔۔۔۔۔ کئی بار آپ کہہ چکے ہیں کہ ٹانگوں میں بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے ڈاکٹر بھی آپ سے یہی کہہ چکے ہیں کہ آپ کی صحت بہت گر گئی ہے، اب خدا کے لیے رات کا کام بند کر دیجئے۔

مارکس: رات کا کام بند کر دوں تو کھاؤں کہاں سے؟

بیوی: یہی تو آفت ہے بغیر کام کئے ایک پیسہ بھی نہیں مل سکتا

مارکس: کتاب چھپ جائے تو میرے دکھ و درد دور ہو جائیں گے۔ اس صورت میں جب کہ مسودہ گھر میں پڑا ہے میں موت کی خواہش بھی تو نہیں کر سکتا

بیوی: کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہو؟

مارکس: وہ کتاب جس کے لیے میں نے اپنی صحت، اپنی خوشی اور اپنے بیوی بچوں تک کو قربان کر دیا۔ اگر میری موت کے بعد شائع ہو تو کیا مجھے افسوس نہ ہوگا تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو کہ بہت سے آدمی جو اپنے آپ کو عملی کہتے ہیں میری اس علمی مشغولیت کو بے ثمر اور بے کار کہتے رہے ہیں۔ میں ان کی اس بے وقوفی پر ہنستا رہا ہوں۔ یہ میری ہنسی صرف اسی صورت میں کامیاب ہوگی اگر یہ کتاب چھپ گئی۔

بیوی: اصل میں یہی لوگ جو خود کو عملی آدمی کہتے ہیں بہت بڑے بے عمل ہیں

مارکس: اگر میں ''سرمایہ'' کو مرتب کیے بغیر مر جاتا تو اپنے آپ کو انہی بے عمل آدمیوں کے زمرے میں شمار کرتا لیکن مجھ ایسے حساس انسان کے لیے ناممکن تھا کہ انسانیت کی چیخ سنتا اور خاموش رہتا۔ صرف وہی انسان دوسرے انسانوں کے دکھ درد سے بے پرواہ رہ سکتا ہے جس کی کھال موٹی ہو۔

بیماری سے نجات حاصل ہوئی تو 1876ء میں کارل مارکس خود اپنی تصنیف ''سرمایہ'' کا مسودہ لے کر ہمبرگ گیا۔ 12 اگست کو ''سرمایہ'' کی کاپیوں کی تصحیح کا کام ختم ہوا۔ پہلی جلد نکل آئی دوسری اور تیسری جلد میں ترمیم و تنسیخ کا کام ہوتا رہا مگر کارل مارکس کے ہاتھوں سے قدرت کو جو کام کرانا تھا۔ قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ اب اس کی دنیا میں ضرورت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ پہلے اس کی رفیقہ حیات کا 2 دسمبر کو انتقال ہوا اور وہ خود 14 مارچ 1883ء کو بوقت سہ پہر اس جہان سے رخصت ہوا۔ 18 مارچ کو اسے دفن کیا گیا۔ اینجلز نے اس کی قبر پر تقریر کرتے

ہوئے کہا۔

اینجلز: 14 مارچ سہ پہر کو پونے تین بجے دنیا کا سب سے بڑا دماغ اٹھ گیا۔ اس کی موت سے پرولتاریہ جدوجہد اور تاریخ کے نظریہ واقعیت کو جو صدمہ پہنچا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ ڈارون نے اگر قدرت کے ارتقاء کا قانون دریافت کیا ہے تو مارکس نے سماج کے ارتقاء کا قانون دریافت کیا ہے۔ اس نے موجودہ سرمایہ دارانہ اور بورژوائی سماج کے محرکات بتائے ہیں اس نے ہمیں سمجھایا ہے کہ انسان کو سیاست، علم، فن اور مذہب کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنے سے پہلے کھانے، پینے، پہننے اور رہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر ملک کے دستور علوم وفنون اصول وقانون اور ایک حد تک اس کے باشندوں کی شریعت کے بنیادی اصول اس کے سماج کے اقتصادی حالات میں مضمر ہوتے ہیں اور اگر کسی ملک کے آئین قوانین اور مذہبی خیالات کی بابت معلوم کرنا ہو کہ وہ کیوں اور کس طرح پیدا ہوئے تو اس ملک کی اقتصادی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیے کیوں کہ زمانے کے اقتصادی حالات ہی ان خیالات کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

جون آف آرک کا مقدمہ

جون آف آرک کے سوانح حیات سے تو قریب قریب آپ سب واقف ہوں گے 1429ء میں فرانس کی حالت بہت بری تھی۔ انگلستان کی فوج فرانسیسی سپاہیوں کو شکست پر شکست دے رہی تھی۔ ہر جگہ انگریزی فوج کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ہنری پنجم کی وفات کے بعد بھی حالات درست نہ ہوئے۔ پیرس انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ چارلس ہفتم تخت سے بد دل ہو گیا تھا۔ اس کے حمایتی جی چھوڑ کر تتر بتر ہو گئے تھے اورلینز کے شہر کا محاصرہ ہوئے پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ قریب تھا کہ یہ انگریزوں کے ہاتھ میں چلا جائے کہ جون آف آرک، دیہات کی ایک سترہ سالہ لڑکی مردانہ وار آگے بڑھی۔ سیدھی چارلس ہفتم شاہ فرانس کے پاس گئی اس سے کہنے لگی کہ مجھے خدا نے تیری مدد کے واسطے بھیجا ہے شروع شروع میں کسی نے اس کا اعتبار نہ کیا مگر کچھ دیر بعد اس نے فرانس کی مردہ فوج میں نئی روح پھونک دی۔ زرہ بکتر پہنے، ہاتھ میں جھنڈا لیے، گھوڑے پر سوار اس نے کئی میدان جیتے اورلینز کے شہر پر اس انگریزوں کا محاصرہ اٹھ گیا۔ اس کے بعد فتح و نصرت ہر قسم پر فرانسیسی سپاہیوں کے پاؤں چومنے لگی۔ چند مہینوں کی لگاتار کوششوں کے بعد 18 جولائی کو وہ چارلس ہفتم کی رسم تاج پوشی میں شریک تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جون آف آرک نے واپس دیہات میں چلے جانے کی خواہش ظاہر کی مگر بادشاہ فرانس نے قبول نہ کی اور اصرار کیا کہ وہ اس کے پاس ہی رہے پھر جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے کہ انگریزوں کے قائم مقام ڈیوک آف بیڈفورڈ کی طاقت اور شاہ فرانس

کی سستی اور کم ہمتی کے باعث حالات نے پلٹا کھایا۔ پیرس پر انگریزوں نے حملہ کیا جس میں جون آف آرک زخمی ہوئی۔ ایک آدمی بستاروی وندوم نے اسے گرفتار کرلیا۔ انگریز جو اس سے بہت خائف تھے اور پانچ ہزار جوانوں جتنا اہم سمجھتے تھے۔ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ بیڈفورڈ اور بستاروی وندوم کے درمیان سودا شروع ہوا۔ بالآخر جون آف آرک ایک بہت بڑی قیمت پر فروخت ہوکر انگریزوں کے ہاتھ آ گئی۔ روون کے قلعے میں بھاری زنجیریں پہنا کر اسے قید کردیا گیا۔ تقریباً ایک سال تک اٹھارہ انیس برس کی یہ لڑکی پابہ زنجیر رہی اس کے بعد مذہبی عدالت میں انگریزوں کے ایماء پر اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس کا کوئی وکیل نہیں تھا۔ کلیساؤں کے پادری، لاٹ پادری، بشپ، مفتی، علم دینیات کے بڑے بڑے ماہرین اور قانون دان جن کی تعداد پچانوے تک پہنچتی ہے، اس کے منصف تھے۔

مقدمے کا آغاز

بشپ: جون آف آرک، گاسپل پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ جو سوال تم سے کیے جائیں گے، تم ان کا صحیح جواب دو گی اور سچ بولو گی۔

جون آف کارک: مجھے حکم ہوا کہ میں قسم نہ کھاؤں

بشپ: تمہیں کس نے حکم دیا ہے؟

جون: خدا نے میرے کانوں میں آواز آئی ہے کہ میں قسم نہ کھاؤں اور پھر مجھے

یہ بھی تو معلوم نہیں کہ مجھ سے کیا کیا سوال کئے جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ مجھ سے ایسی باتیں پوچھیں جن کا جواب دینا میں مناسب خیال نہ کروں۔

بشپ: تمہیں سچ بولنے کے لیے حلف اٹھانا ہوگا

جون: فرانس میں آ کر میں نے کیا کچھ کیا میرے ماں باپ کون تھے اگر آپ ایسی باتیں پوچھیں تو میں حلف اٹھانے کے لیے تیار ہوں لیکن خدا کی طرف سے مجھے کیا الہامات وصول ہوئے اس کے بارے میں آپ کو سچی باتیں بتانے کے لیے میں کبھی حلف نہیں اٹھاؤں گی خواہ میری جان ہی چلی جائے۔

الہامات کے متعلق میں نے صرف اپنے بادشاہ چارلس سے بات چیت کی ہے اور کسی سے نہیں۔

بشپ: تمہاری عمر کیا ہے؟

جون: میرے خیال میں انیس برس کی

بشپ: تم نے دینی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

جون: اپنے ماں باپ سے

بشپ: دعا سناؤ

جون: (طنز کے ساتھ) اس وقت سن لیجئے گا، جب میں اعتراف گناہ کروں گی

بشپ: اعتراف گناہ کا موقعہ اب تمہیں نہیں ملے گا اس لیے کہ آئندہ تمہیں گرجا گھر جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی

جون: کیوں؟

بشپ: اس لیے کہ تم بے دینی اور الحاد کے الزام میں گرفتار ہو

جون: مجھے یہ پابندی منظور نہیں اور پھر میرے پاؤں میں یہ زنجیریں کیوں باندھی جاتی ہیں۔

بشپ: اس لیے کہ تم فرار نہ ہوسکو

رؤدن کے قلعے میں جون آف آرک جس کی عمر انیس برس سے زیادہ نہ تھی، قید تھی۔ اس کے پاؤں میں ہر وقت لوہے کی موٹی موٹی زنجیریں رہتی تھیں تا کہ وہ بھاگ نہ سکے۔ پہرے پر تین انگریز فوجی افسر متعین تھے۔ مقدمے کی پہلی سماعت 22 فروری کو ہوئی تھی، دوسری سماعت دوسرے ہی روز ہوئی۔ ایک بار پھر اس سے گوسپل پر دونوں ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانے کو کہا گیا تو اس نے انکار کیا مگر بعد میں بدرجہ مجبوری اس نے یہ حلف اٹھالیا سوالات شروع ہوئے۔

جیین: بچپن میں تمہارے کیا شغل تھے؟

جون: سینا پرونا اور چرخہ کاتنا، زیادہ تر گھر میں رہتی تھی اور باہر کھیتوں میں بہت کم جاتی تھی۔

بشپ: سینا پرونا تم کیسا جانتی ہو؟

جون: شہر بھر میں ایسی کوئی عورت نہیں جو سینے پرونے میں میرا مقابلہ کر سکے۔

جیین: سب سے پہلی الہامی آواز تمہیں کب سنائی دی؟

جون: جب میں تیرہ برس کی تھی

جیین: یہ آواز کس کی تھی؟

جون: خدا کی۔۔۔۔اس نے مجھ سے کہا کہ میں پاک زندگی بسر

کروں ۔۔۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں اپنے باپ کے باغ میں کھڑی تھی ۔ جب مجھے یہ آواز سنائی دی، میں ڈر گئی ۔

دینیات کا ماہر: یہ آواز تمہیں کس طرف سے سنائی دی تھی۔ دائیں طرف سے یا بائیں طرف سے؟

جون: دائیں طرف سے آواز سے پہلے مجھے روشنی دکھائی دی تھی

دینیات کا ماہر: ہوں ۔۔۔۔۔ تمہاری نجات کے لیے اس آواز نے تمہیں کیا ہدایات دی تھیں؟

جون: یہ آواز مجھ سے کہتی تھی کہ میں نیک اور پاک زندگی بسر کروں چرچ جایا کروں اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں فرانس جاؤں

جین: شنون کے قلعے میں بادشاہ سے ملاقات کرنے کے لیے بھی اسی آواز نے تمہیں حکم دیا تھا؟

جون: اسی آواز نے چونکہ بشارت ہوئی تھی اس لیے بادشاہ کو میں نے فوراً پہچان لیا

جین: بشارت کے وقت بھی کیا تمہیں روشنی نظر آئی تھی؟

جون: مجھے یاد نہیں

دینیات کا ماہر: بشارت میں جب تم نے اپنے بادشاہ کو دیکھا تو کیا اس کے سر پر کسی فرشتے کا سایہ تھا؟

جون: میں اس کا جواب دینے کے لیے تیار نہیں

جین: یہ الہامی آوازیں کیا تم اکثر سنتی ہو؟

جون: ہر روز سنتی ہوں یہی آوازیں تو میری تسکین کا باعث ہیں

اسی طرح کے سوالات اس پر مقدمے کی تیسری ساعت میں کئے گئے۔ ایک وقت میں کئی آدمی اس پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتے تھے مگر کہتے ہیں کہ وہ مطلق گھبراتی نہیں تھی۔ اس کو جادوگرنی، کافر اور ملحد ثابت کرنے کے لیے یہ عدالت بٹھائی گئی اس لیے ہر منصف کی یہی کوشش تھی کہ جون کے بیانات سے وہ تمام الزام ثابت ہو جائیں جو اس پر لگائے گئے تھے کہ یہ اس نے الہامی آوازوں کا ڈھونگ رچا کر کلیسا اور مذہب کی بے حرمتی کی اور ہزارہا انسانوں کا خون بہایا مقدمے کی تیسری ساعت میں باسٹھ اسیر تھے۔ چوتھی ساعت سے ایک روز پہلے وہ بیمار ہوگئی جس پر شاہ انگلستان کو سخت فکر لاحق ہوئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جون بیماری سے مر جائے وہ اس کی موت قانون کے ہاتھ سے چاہتا تھا چنانچہ جون کا علاج کیا گیا جب وہ تندرست ہوگئی تو پھر سوالات کا وہی سلسلہ شروع ہوا۔

بشپ: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتی ہو کہ پریاں بدارواح ہیں؟

جون: مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں

بشپ: تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا سینٹ کیتھرین اور سینٹ مارگریٹ کو انگریزوں سے نفرت ہے؟

جون: ان کو صرف انہی چیزوں سے پیار ہے جو ہمارے رسول کو پیاری ہیں اور وہ ان تمام چیزوں سے نفرت کرتے ہیں جن سے خدا نفرت کرتا ہے

جیین: کیا خدا انگریزوں سے نفرت کرتا ہے؟

جون: خدا انگریزوں سے نفرت کرتا ہے یا محبت، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم

نہیں لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ سب انگریز فرانس سے باہر نکال دیئے جائیں گے سوائے ان کے جو یہاں مریں گے اور یہ کہ خدا فرانس کو فتح اور انگریزوں کو شکست دے گا۔

بشپ: کیا خدا اس وقت انگریزوں کے حق میں تھا جب وہ فرانس میں پھل پھول رہے تھے؟

جون: مجھے معلوم نہیں کہ خدا کس کے حق میں تھا لیکن میرا ایمان یہ ہے کہ خدا نے ان کو ان کے گناہوں کی سزا دی۔

دینیات کا ماہر: اگر تم شادی شدہ ہوتیں تو کیا تمہیں الہامی آوازیں سنائی دیتیں؟

جون: میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی

لارڈ بشپ: جون! یہ سب لوگ جو تمہارے سامنے بیٹھے ہیں، صاحب علم و فضل ہیں، دینیات کے ماہر ہیں ان سب پر فرض عائد ہے کہ وہ کمال مہربانی اور شفقت سے کسی انتقامی جذبے کو اپنے دل میں جگہ دیئے بغیر تمہیں گمراہی سے بچائیں اور نیکی کا صحیح راستہ بتائیں۔ چونکہ تم ان پڑھ ہو اور دینی علوم سے تمہیں زیادہ واقفیت نہیں ہے اس لیے ہم تمہیں اپنے درمیان میں سے ایک وکیل دینے کے لیے تیار ہیں جس سے تم مشورہ لے سکو گی۔ اگر تم خود ہم میں سے کوئی آدمی اس کام کے لیے منتخب نہ کرو گی تو ہمیں یہ خود یہ انتخاب کرنا پڑے گا۔ بولو اس بارے میں تم کیا چاہتی ہو؟

جون: میں آپ کی اس عنایت کی شکر گزار ہوں آپ کے علاوہ ان سب کی بھی

ممنون و متشکر ہوں جو میرے سامنے بیٹھے ہیں لیکن مجھے کسی وکیل کی ضرورت نہیں اس لیے کہ میں اپنے رسول کے مشوروں سے منہ موڑنا نہیں چاہتی۔ میں اپنی الہامی آوازوں کو اس وکیل پر ترجیح دیتی ہوں۔

سارے مقدمے کی تفصیل بیان کرنے کے لیے بہت وقت درکار ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ انصاف کرنے والے جو نا انصافی کرنے پر تلے ہوئے تھے ایک عرصے تک دیہات کی اس بہادر اور نڈر لڑکی سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ جب اس کے بیانات ختم ہوئے تو اس کے خلاف بے شمار جرائم کی فہرست تیار کی گئی۔ اس کو دھمکیاں دی گئیں۔ اس سے جھوٹے وعدے بھی کئے گئے کہ اگر وہ اعلانیہ طور پر خود کو تائب ظاہر کرے تو سزا میں رعایت کر دی جائے گی۔ آخر عورت ذات تھی ایک برس کی قید کی تکلیفوں ساٹھ ساٹھ ستر ستر آدمیوں کی جرح نے اور پاؤں کی زنجیروں نے اس بے چاری کو سخت پریشان کر دیا تھا۔ موت سے کون خوف نہیں کھاتا اور پھر وہ موت جو آگ میں جل کر نصیب ہو، کتنی ہولناک ہے جون نے ڈر کے مارے منصفوں کے کہنے پر اپنے تائب ہونے کا اعلان کر دیا۔ سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی اور اس سے وعدہ کیا گیا کہ اس کو باقاعدہ نماز پڑھنے کی اجازت مل جائے گی مگر شاہ انگلستان اس فیصلے سے کیسے مطمئن ہو سکتا تھا چنانچہ ایک چال چلی گئی۔ قید خانے سے عورتوں کا لباس ہٹایا گیا۔

بشپ: تم نے پھر مردوں کا لباس پہن لیا ہے؟

جون: میں نے اپنی مرضی سے پہنا ہے اس لیے کہ میرے خیال کے مطابق

اس وقت یہی لباس بہتر ہے۔

بشپ: تم نے اتنے آدمیوں کے سامنے قسم کھائی تھی کہ تم پھر کبھی یہ لباس نہ پہنو گی؟

جون: میرا ہرگز یہ منشاء نہیں تھا کہ یہ لباس ترک کرنے کی قسم کھاؤں

بشپ: سوال یہ ہے کہ تم نے مردوں کا لباس کیوں پہنا؟

جون: اس لیے پہنا ہے کہ اس وقت یہی موزوں و مناسب ہے اس لیے کہ میں مردوں کے درمیان رہتی ہوں میں نے یہ لباس اس لیے پھر اختیار کیا ہے کہ مجھ سے جو وعدے کیے گئے تھے۔ پورے نہیں ہوئے مجھ سے کہا گیا تھا کہ مجھے گرجے میں جانے کی اجازت دی جائے گی اور میرے پاؤں کی زنجیریں ہٹالی جائیں گی مگر کچھ بھی تو نہیں ہوا۔

بشپ: تائب ہوتے وقت کیا تم نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ یہ لباس ترک کردو گی؟

جون: اگر آپ میری زنجیریں جدا کردیں مجھے کسی اچھے قید خانے میں رکھیں او رمیرے ساتھ کسی عورت کے رہنے کا انتظام کریں تو میں یہ لباس اتار دوں گی۔

بشپ: کیا تم نے تائب ہونے کے بعد بھی الہامی آوازیں سنی ہیں؟

جون: سنی ہیں

بشپ: کیا کہا گیا ہے تم سے؟

جون: مجھ سے خدا نے سینٹ کیتھرائن کے ذریعے سے یہ کہلوایا ہے کہ میں نے تائب ہونے میں سخت غلطی کی ہے۔ جان بچانے کے لیے میں نے اپنی روح کو پستیوں میں گرا دیا ہے۔۔۔لیکن میں کیا کرتی۔ میں اس وقت ڈر گئی تھی

اگر میں کہتی کہ مجھے خدا نے بھیجا ہے تو مجھے آگ میں جھونک دیا جاتا۔۔۔۔۔لیکن سچی بات یہی ہے کہ مجھے خدا نے بھیجا ہے۔۔۔۔۔اور خدا نے مجھ سے کہا ہے کہ اس کا کھلم کھلا اعلان کرنے سے خائف ہو کر میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔

بشپ: کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ آواز سینٹ کیتھرین کی تھی؟

جون: مجھے اس کا یقین ہے اور میں اس پر بھی ایمان رکھتی ہوں کہ یہ آوازیں خدا کی طرف سے آتی ہیں۔

بشپ: تائب ہوتے وقت تم نے ہزار ہا آدمیوں کے سامنے مانا تھا کہ ان آوازوں کے متعلق تم نے جھوٹ بولا تھا؟

جون: میں نے اس وقت جو کچھ کہا آگ سے ڈر کر کہا لیکن میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی جو خدا اور مذہب کے خلاف ہو۔۔۔۔۔اگر آپ لوگوں کی اسی میں خوشی ہے کہ میں زنانہ لباس پہنا کروں تو میں یہی لباس پہن لیا کروں گی لیکن اس کے سوا میں اور کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں۔

بشپ: تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ آوازیں جو تمہیں سنائی دیتی ہیں نیک ارواح کی ہیں یا بد ارواح کی؟

جون: مجھے معلوم نہیں خدا بہتر جانتا ہے

دوسرا پادری: کیا آوازیں سچ مچ حقیقی ہوتی ہیں؟

جون: حقیقی ہوں یا مصنوعی، مجھے سنائی دیتی ہیں نیک ارواح کی ہوتی ہیں یا بد ارواح کی؟ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

بشپ: ہمارا خیال ہے کہ دراصل ان کی کوئی حقیقت نہیں

دوسرا پادری: تم غور کرو کہ یہ آوازیں تم سے کئی بار کہہ چکی ہیں کہ اس مقدمے سے تم بری ہو جاؤ گی مگر تم بری نہیں ہوئیں۔

بشپ: ان آوازوں نے اس دوران میں تم سے کئی وعدے کئے ہیں سچ سچ کہو ان میں سے کوئی وعدہ پورا ہوا ہے؟

دوسرا پادری: یہ تمہارا وہم تھا۔

بشپ: ممکن ہے بدارواح نے تمہیں گمراہ کیا ہو۔

دوسرا پادری: تمہیں غور کرنا چاہیے سوچنا چاہیے

جون: (گھبرا کر) مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری موت کے باعث آپ ہی ہوں گے۔

بشپ: جون! انجام جو کچھ بھی ہوگا تمہیں صبر کے ساتھ برداشت کرنا پڑے گا۔ سزائے موت تمہیں صرف اس لیے ملے گی کہ تم اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکی ہو۔

دوسرا پادری: جو کہ سب سے بڑا جرم ہے خدا اور کلیسا کا

بشپ: جون! اب سوچو کہ تمہاری آوازیں کدھر گئیں۔ ان سے تمہیں کیا فائدہ پہنچا ہے یہ تمہیں موت کے منہ سے بچا سکتی ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کبھی نہیں کیا ان آوازوں نے تمہیں صریحاً دھوکہ نہیں دیا؟

جون: بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے

بشپ: بظاہر نہیں، حقیقت میں ان آوازوں نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ کیا اب

بھی تمہیں ان کی صحت پر یقین ہے؟

جون: مجھے اب سوائے خدا کے اور کسی پر یقین نہیں

بشپ: شاباش

دوسرا پادری: کیا ان آوازوں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا؟

جون: دیا ہے

دوسرا پادری: شاباش

انیس برس کی ناتواں لڑکی پر بالآخر اس کے منصفوں نے فتح پالی۔ چنانچہ جون دوسرے روز صبح نو بجے اس قید خانے سے نکالی گئی جہاں اس نے ایک سو اٹھتر دن جسمانی اور روحانی اذیتوں میں گزارے تھے۔ اس کو ایک چھکڑے میں بٹھایا گیا اور اسی ہتھیار بند فوجیوں کے پہرے میں وہ پرانی منڈی کے چوک میں لائی گئی جہاں تین بڑے بڑے مچان تیار کئے گئے تھے۔ ایک چبوترے پر پادری وغیرہ بیٹھے تھے جنہیں فیصلہ سناتا تھا۔ دوسرے چبوترے پر جون کو کھڑا کر دیا گیا۔ تیسرے چبوترے پر جو چونے اور کچ کا بنا ہوا تھا۔ چوک کے عین درمیان تھا۔ اس پر ایندھن کا ایک انبار لگا تھا۔ چوک میں اتنے تماشائی جمع تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ کھوے سے کھوے چھلتا تھا۔ بہت بڑے میلے کا سماں تھا۔ چھتوں پر کھڑکیوں میں ہر جگہ تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ فیصلہ سنایا گیا۔

بشپ: ہم فتوی دیتے ہیں کہ تم ایک گمراہ اور ملحد عورت ہو۔ اس خیال سے کہ تم دوسرے عیسائیوں کو گمراہی اور الحاد کا راستہ نہ دکھاؤ۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں چرچ کے رشتے سے منقطع کر دیا جائے اور تمہیں عام انسانی عدالت کے حوالے کر

دیا جائے۔ ہم تمہیں مذہب سے علیحدہ کر رہے ہیں، تم پر بے دینی کا فتویٰ عائد کرتے ہیں اور عام انسانی عدالت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ سزا دیتے وقت تم پر رحم کرے۔

جون: (روتے ہوئے) مجھے ان تمام آدمیوں سے جو میرے اردگرد جمع ہیں رحم کی درخواست کرنا ہوگی۔۔۔۔۔۔۔۔ان لوگوں سے جو ہنس کھیل رہے ہیں۔

بشپ: انہی لوگوں کے ہاتھ میں اب تمہاری قسمت کا فیصلہ ہے۔

جون: میری قسمت۔۔۔۔۔۔۔! (روتے ہوئے مگر بلند آواز میں) میری قسمت کا فیصلہ کرنے والو دیکھو میں زانوؤں پر گر کر تم سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔اگر میں نے تمہیں دکھ پہنچایا ہے تو میں اس کے لیے معافی مانگتی ہوں۔۔۔۔۔میرے فرانسیسی بھائیو! میں پہلے تم سے مخاطب ہونا چاہتی ہوں۔۔۔۔اگر میرے دل میں وطن کی محبت نہیں ہے، اگر میرے افعال سے فرانس کو اور تم کو جو اس کے فرزند ہو کوئی نقصان پہنچا ہے تو مجھے معاف کر دو۔۔۔۔میں سچ کہتی ہوں کہ تمہارا بادشاہ بالکل بے گناہ ہے۔۔۔۔۔جو کچھ میں نے کیا ہے اس کی ذمہ دار صرف میں ہوں وہ بالکل بے قصور ہے مجرم میں ہوں۔۔۔۔میں جو اس وقت لاکھوں آدمیوں کے سامنے سر جھکائے کھڑی ہوں۔میں نے فوجوں کی کمان سنبھالی ہے، میں نے تلواروں اور تیروں کی چھاؤں میں کئی کارنامے سرانجام دیئے ہیں لیکن اس وقت میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔۔۔۔۔اگر مجھے الہامی آوازیں سننے میں دھوکا ہوا ہے تو مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔۔میرے بھائیو۔۔۔۔۔۔تم سب فرانس سے محبت کرتے

ہو۔۔۔میرا خیال تھا کہ مجھے بھی فرانس سے محبت ہے۔۔۔۔۔۔تم کہو تو میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ مجھے فرانس سے محبت نہیں تھی، میں نے اس سے غداری کی۔۔۔۔۔میں یہ سب کچھ ماننے کے لیے تیار ہوں۔۔۔۔۔۔لیکن مجھے معاف کر دو۔۔۔۔میں سب سے معافی مانگی ہوں، انگریزوں سے جنہیں میں اپنے وطن کا دشمن سمجھتی رہی ہوں۔۔۔۔۔۔ان سپاہیوں سے جو میرے جھنڈے تلے ان انگریزوں سے لڑتے رہے ہیں۔ میں سب سے گڑگڑا کر معافی مانگتی ہوں۔۔۔۔۔پادریوں، مفتیوں اور دینیات کے ماہروں سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ میری نجات کے لیے دعا مانگیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک جون آنکھوں میں آنسو لئے اس طرح گڑگڑا کر تماشائیوں سے معافی مانگی رہی لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔اس دوسرے چبوترے پر کھڑا کر کے اردگرد ایندھن کی لکڑیاں چن دی گئیں۔ کہتے ہیں کہ اس نے انگریز سے جو اس کے پاس ہی چبوترے پر کھڑا تھا صلیب مانگی اس انگریز نے دو تنکے جوڑ کر صلیب بنائی اور جون کو دے دی۔ جون نے یہ صلیب اپنے سینے کے ساتھ لگا لی۔ ایندھن کو آگ دکھائی گئی۔خشک لکڑیاں چٹخ چٹخ کر اس ظلم کی فریاد کرنے لگیں۔ گاڑھے دھوئیں نے کنواری جون کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ چھ مرتبہ اس نے ''یسوع مسیح'' کہا۔۔۔۔۔اس کے بعد کوئی آواز اس کی چتا سے نہ آئی۔۔۔۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆

انصاف

دروازہ کھلتا ہے۔چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار: باادب ، باملاحظہ، ہوشیار،نظریں روبرو،شہنشاہ عالم لنچ کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔

شہنشاہ عالم کے قدموں کی بھاری چاپ سنائی دیتی ہے۔اس کے بعد وہ تشریف لاتے ہیں۔شہنشاہ: ہیڈ بٹلر کہاں ہے؟

چوبدار ایک بہت بڑی ڈش سے سرپوش اٹھاتا ہے۔ ہیڈ بٹلر پھدک کر باہر نکلتا ہے اور عرشی سلام کرتا ہے۔

ہیڈ بٹلر: غلام سیلوٹ بجالاتا ہے جہاں پناہ

شہنشاہ: دسترخوان پر آج مابدولت کے لیے کیا کیا چیز حاضر ہے؟

ہیڈ بٹلر: گوشت پلاؤ، ماہی پلاؤ،مٹر پلاؤ، نارنگی پلاؤ،تنجن، بریانی، زردہ، روغن جوش،قورمہ،ٹماٹر گوشت،بھنڈی گوشت،مٹر گوشت، پائے کا شوربہ، قیمہ بھیجا،چکن کٹلس،چکن چاپس،مٹن چاپس،پوٹیٹو چانس اور خدا جہاں پناہ کا بھلا کرے ارہر کی دال

شہنشاہ: (غصے میں) ارہر کی دال، مابدولت کو بالکل پسند نہیں

ہیڈ بٹلر: یور میجسٹی،آج لنچ پر تین اشترا کی ولایتوں کے وزیر اعظم مدعو ہیں اس لیے۔۔۔۔

شہنشاہ: (خوش ہوکر) مابدولت تمہاری فراست کی داد دیتے ہیں اور خوش ہوکر تمہارا منہ موتیوں سے بھر دینے کا حکم جاری کرتے ہیں۔

ہیڈ بٹلر: میری سانس رک جائے گی عالم پناہ

شہنشاہ: (مسکرا کر) تم بہت ذہین ہو اچھا مابدولت تمہیں سر کا خطاب عنایت کرتے ہیں۔

ہیڈ بٹلر: جہاں پناہ کی اس قدر افزائی نے ذرے کو آفتاب بنا دیا۔

شہنشاہ: اور کس صفائی سے ہینگ لگی نہ پھٹکڑی

ہیڈ بٹلر: غلام سیلوٹ بجالاتا ہے، یور میجسٹی

دروازہ کھلتا ہے چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار: با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار، نظریں روبرو، با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار، نظریں روبرو ملکہ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

چھوٹے چھوٹے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے ملکہ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

ملکہ: جہاں پناہ کو زیادہ دیر تو میرا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں اپنی خادماؤں کے سر میں جوئیں ڈلوا رہی تھی۔

شہنشاہ: کیوں؟

ملکہ: رعایا کے لیے میں ایک بلڈ بینک کھولنے کا ارادہ رکھتی ہوں

شہنشاہ: امور سلطنت سے تمہاری یہ دلچسپی مابدولت کے لیے باعث مسرت

ہوئی ۔۔۔۔۔۔!

ہیڈ بٹلر: رعایا کتنی خوش نصیب ہے کہ آپ ایسا مخلص بادشاہ اور آپ ایسی مخلص ملکہ اس پر حکمران ہیں۔

شہنشاہ: پہلے یونہی مشہور تھا کہ فلاں بادشاہ کے راج میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے لیکن ہمارے راج میں ایسے کئی گھاٹ موجود ہیں جہاں شیر اور بکری اکٹھے پانی پیتے ہیں اور اس کو حلقہ امکان میں لانے کے لیے مابدولت کو تمام شیروں کے دانت نکلوانے اور تمام بکریوں کے سینگ کٹوانے پڑے۔

ہیڈ بٹلر: اس میں کیا شک ہے

گھٹی کی آواز بلند ہوتی ہے

شہنشاہ: (چونک کر) یہ کس نے ہمیں بلایا یہ کون فریادی ہے جس نے عدل و انصاف کی آہنی زنجیر کو جنبش دی؟

ملکہ: جہاں پناہ! کیا اسی وقت تشریف لے جائیں گے؟

شہنشاہ: اسی وقت، اسی گھڑی، جب تک ہم اس فریادی کی فریاد نہیں سن لیں گے ارہر کی دال ہم پر حرام ہے۔ ہم ابھی جھروکے میں جا کر فریادی سے ملاقات کریں گے، ضرور کسی انسان پر ظلم ہوا ہے۔

چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار: با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار، نظریں رو برو، با ادب، با ملاحظہ ہوشیار، نظریں رو برو، شہنشاہ عالم فریادی کی فریاد سننے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔

شہنشاہ، ملکہ اور ہیڈ بٹلر تینوں باہر جھروکے میں تشریف لے جاتے ہیں۔

شہنشاہ: یہ کون تھا جو نے ہمارے عدل و انصاف کی آہنی زنجیر ہلائی اور ہمارا انصاف چاہا۔

فریادی: یہ غلام انصاف کا طالب ہے جہاں پناہ

شہنشاہ: تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا فریادی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنا ہمارا کام ہے۔

فریادی: عالم پناہ آج کل کے ایک سیر دودھ میں صرف دو قطرے دودھ کے ہوتے ہیں باقی سب پانی ہوتا ہے۔

شہنشاہ: مطمئن رہو فریادی دودھ کے یہ دو قطرے ہی علیحدہ کر کے دکھا دیئے جائیں گے۔ بولو، بے خوف و خطر ہو کر بولو کہ تمہیں کس نے دکھ پہنچایا ہے کیا ملکہ عالم کے پستول سے تمہاری بیوی۔۔۔۔۔۔؟

فریادی: نہیں عالی جاہ! ملکہ عالم کے پستول سے میری بیوی ہلاک نہیں ہوئی۔

شہنشاہ: تاریخ نے خود کو نہیں دہرایا۔ یہ بھی ایک بہت بڑی بات ہے بولو، تم کام کیا کرتے ہو؟

فریادی: عالم پناہ کے سائے تلے اس غلام نے ایک بہت بڑی لانڈری کھول رکھی ہے۔

شہنشاہ: کپڑے گھاٹ پر تم خود دھوتے ہو؟

فریادی: نہیں عالم پناہ! یہ ذلیل کام میں نے دوسروں کے سپرد کر رکھا ہے۔

شہنشاہ: ایسا ہی ہونا چاہیے اب بتاؤ تمہیں کیا دکھ پہنچا ہے؟

فریادی: جہاں پناہ! مجھے بہت بڑا دکھ پہنچا ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں جو

میں بیان کرسکوں۔

شہنشاہ: (تھوڑی دیر غور وفکر کرنے کے بعد) فریادی! تم کوئی فکر نہ کرو۔ ہم الفاظ کا بندوبست کئے دیتے ہیں ہیڈ بٹلر؟

ہیڈ بٹلر: غلام حاضر ہے جہاں پناہ

شہنشاہ: تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہم نے سر کے خطاب سے تمہیں سرفراز کیا تھا

ہیڈ بٹلر: غلام اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کر چکا ہے۔

شہنشاہ: اب خود کو اس قدر افزائی کا حق دار ثابت کرو۔ ہم تمہیں وزیر الفاظ کا رتبہ بخشتے ہیں تا کہ تم اس فریادی کی فریاد کو مناسب وموزوں الفاظ میں ترتیب دے کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔

ہیڈ بٹلر: غلام اس فرض سے سبکدوش ہونے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔

شہنشاہ: تم مطمئن ہو فریادی؟

فریادی: میں بالکل مطمئن ہوں عالم پناہ

شہنشاہ: وزیر الفاظ جاؤ، فریادی کی فریاد ایک رپورٹ کی صورت میں پیش کرو۔

ہیڈ بٹلر: کام کی اہمیت کے پیش نظر غلام ایک ماہ کی مہلت کے لیے درخواست کرتا ہے

شہنشاہ: مابدولت دو ماہ کی مہلت عطاء کرتے ہیں

ہیڈ بٹلر: شکریہ!

فریادی: شکریہ!

دروازہ کھلتا ہے چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار: با ادب ، ملاحظہ، ہوشیار، نظریں رو برو، با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار، نظریں رو برو۔۔۔شہنشاہ عالم دو مہینے کے بعد لانڈری والے کیس کے متعلق ہیڈ بٹلر المعروف وزیر الفاظ کی رپورٹ سننے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔

شہنشاہ جھروکے میں تشریف رکھتے ہیں

شہنشاہ: وزیر الفاظ! لانڈری والے فریادی کی رپورٹ مناسب وموزوں الفاظ میں تیار ہوئی؟

ہیڈ بٹلر: دو مہینے کی مسلسل محنت ومشقت اور عرق ریزی کے بعد ہی یہ ہیچمدان ایک کروڑ الفاظ کی رپورٹ تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جو پبلک کی آگاہی کے لیے سرکاری پریس میں دھڑا دھڑ چھپ رہی ہے۔

شہنشاہ: فریادی! وزیر الفاظ کے اس کام سے کیا تم مطمئن ہو؟

فریادی: قطعی طور پر عالی جاہ۔۔۔۔۔۔۔۔کام بڑے سلیقے سے ہو رہا ہے۔

شہنشاہ: وزیر الفاظ ہم تھوڑے عرصے کے لیے تمہیں وزیر خلاصہ بنا کر اس رپورٹ کا ملخص پوچھنا چاہتے ہیں جو پبلک کی آگاہی کے لیے سرکاری پریس میں دھڑا دھڑ چھپ رہی ہے۔

ہیڈ بٹلر: رپورٹ کا اصلی خلاصہ یہ ہے عالم پناہ! فریادی ایک بہت بڑی لانڈری کا مالک ہے اس بہت بڑی لانڈری میں تمام کپڑے صابن سے نہیں کسی اور ہی چیز سے دھوئے جاتے ہیں جس کا نسخہ صرف فریادی کو ہی معلوم ہے۔

فریادی: یہ نسخہ سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے عالم پناہ

شہنشاہ: خوب!

ہیڈ بٹلر: ڈرائی کلیننگ کے کام میں بھی فریادی پٹرول استعمال نہیں کرتا۔

فریادی: غلام، پٹرول کا سارا کوٹہ بلیک مارکیٹ میں بیچ دیتا ہے۔

شہنشاہ: بہت خوب!

ہیڈ بٹلر: فریادی کی لانڈری میں ساڑھے سات سو دھوبی کام کرتے ہیں۔ان کو سینہ بہ سینہ چلنے والے اصولوں کے پیش نظر وہی تنخواہ ملتی ہے جو مغلیہ بادشاہوں کے عہد میں دھوبیوں کو ملا کرتی تھی۔فریادی نے چار مہینے ہوئے محسوس کیا کہ اس کے یہ تنخواہ پانے والے ملازم اس کا صابن کھا رہے ہیں۔

شہنشاہ: فریادی نے یہ کیسے محسوس کیا؟

فریادی: ان کا رنگ دن بدن اجلا ہو رہا تھا جہاں پناہ

شہنشاہ: درست

ہیڈ بٹلر: انہوں نے صابن کھانے ہی پر اکتفا نہ کی۔۔۔۔۔۔۔اس غریب کا پٹرول بھی پینا شروع کر دیا۔

فریادی: عالم پناہ۔۔۔۔۔۔۔ان کی دھواں دھار تقریروں نے غمازی کی

شہنشاہ: درست

ہیڈ بٹلر: اپنے تنخواہ پانے والے ملازمین کی اس بلاخوری اور بلانوشی سے تنگ آ کر فریادی نے ایک روز کپڑے سکھانے کے لیے ان کو اس میدان کی طرف روانہ کر دیا جہاں شہزادیاں چاند ماری سیکھتی ہیں۔

شہنشاہ: (فکرمند ہوکر) والاشان شہزادیوں نے بے گناہوں کو ہلاک کردیا؟

ہیڈ بٹلر: ایسا ہی ہوا جہاں پناہ۔۔۔شہزادیوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ وہ ساڑھے سو دھوبی جنگلی انسانوں کی وہ کھیپ ہے جو والاشان شہزادیوں کا نشانہ درست کرنے کے لیے عالم پناہ کے احکام کے مطابق ہر ہفتے فراہم کی جاتی ہے۔

شہنشاہ: دھوبیوں اور جنگلی انسانوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ہیڈ بٹلر: عالم پناہ کا ارشاد بالکل صحیح ہے ساڑھے سات سو دھوبیوں کے لواحقین چنانچہ فریادی کو ان کی ہلاکت کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔

فریادی: فریادی کا قصور صرف اتنا ہے جہاں پناہ کہ اس نے تنگ آکر ان کو اس میدان کی طرف روانہ کر دیا جہاں والا شان شہزادیاں نشانہ درست کریں۔۔۔لیکن افسوس ناک ہلاکت کے بعد جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ غیر ارادی طور پر اس غلام نے جہاں پناہ کو انصاف کرنے کا ایک بہت ہی اچھا موقع بہم پہنچا دیا ہے۔

شہنشاہ: غور کرنے کے بعد ما بدولت بھی اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں تاریخ میں اس سے پہلے جہانگیر کو ایسے موقع سے دو چار ہونا پڑا تھا لیکن ہم عہد جدید کے شہنشاہ ہیں۔۔۔۔جہانگیری عدل فی زمانہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا خون کا بدلہ صرف خون ہے۔

ہیڈ بٹلر: کیا والاشان شہزادیاں خاکم بدہن۔۔۔

شہنشاہ: وزیر الفاظ! ہمیں اپنا فرض ادا کرنے دو

چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے

چوبدار: باادب، باملاحظہ، ہوشیار، نظریں روبرو، باادب، باملاحظہ، ہوشیار، نظریں روبرو۔۔۔۔۔ملکہ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

ملکہ عالیہ کی سواری بال کھولے ہوئے آتی ہے۔

ملکہ: جہاں پناہ! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟

شہنشاہ: خون کا بدلہ خون ہماری مملکت کے ہر در دیوار سے یہی صدا آ رہی ہے خون کا بدلہ خون۔۔۔۔۔۔کوئی خون بہانہ ہوگا۔۔۔۔۔۔!

ملکہ: جہاں پناہ

ہیڈ بٹلر: عالم پناہ!!

فریادی: ساڑھے سات سو دھوبیوں کے لواحقین گیتی پناہ، خون کا بدلہ خون نہیں چاہتے۔۔۔۔۔۔۔فی دھوبی پانچ سو روپے کافی ہیں۔

شہنشاہ: نہیں، مابدولت اپنے دامن عدل پر جہانگیر کی طرح کوئی دھبہ نہیں لگنے دیں گے۔۔۔۔خون کا بدلہ خون ہے خون بہا نہیں خون کا بدلہ صرف خون ہے۔۔۔۔وزیر الفاظ! والا شان شہزادیوں کی تعداد کیا ہے؟

ہیڈ بٹلر: پچھلے برس کے اعداد و شمار کے مطابق والا قدر شہزادیوں کی تعداد ایک سو بیس تک پہنچی تھی جہاں پناہ

ملکہ: ان میں میری کوئی دختر شامل نہیں لیکن میں جہاں پناہ سے پھر بھی درخواست کرتی ہوں کہ۔۔۔۔۔

شہنشاہ: ہمیں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے دو ملکہ۔۔۔۔۔خون کا بدلہ خون ہے

فریادی: جہاں پناہ! ان ساڑھے سات سو دھوبیوں میں خون کا صرف ایک قطرہ تھا

شہنشاہ: تمہیں کیسے معلوم ہے؟

فریادی: سارا خون نچوڑ کر میں نے صرف ایک قطرہ باقی چھوڑ دیا تھا کہ ان میں زندگی کی رمق باقی رہے۔

شہنشاہ: مابدولت کی نگاہ عدل میں خون کے ایک قطرے اور خون کے ایک سمندر میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے پیشتر کہ رجعت پسند قوتیں ہمیں گمراہ کرنے پائیں مملکت کے طول وعرض میں ریڈیو اور اخباروں کے ذریعے سے اعلان کر دیا جائے کہ ہم لانڈری والے کیس کا فیصلہ کرنے میں اپنی مثالی غیر جانب داری سے کام لینے کا تہیہ کر چکے ہیں۔۔۔۔خون کا بدلہ خون ہے۔۔۔۔اس میں کوئی شک نہیں کہ والا شان شہزادیوں کی رگوں میں ہمارا نیلا خون دوڑ رہا ہے لیکن اسے دھوبیوں کے سرخ خون کا بدلہ دینا ہوگا۔۔۔۔۔۔۔ہر چہار اکناف اعلان کر دیا جائے کہ مابدولت نے اس سنگین مقدمے کا فیصلہ مرتب کرنے کے لیے ایک کمیشن بٹھا دیا ہے۔

ہیڈ بٹلر: کمیشن؟

ملکہ: کمیشن؟؟

فریادی: کمیشن؟؟؟

شہنشاہ: ہاں کمیشن یہ کمیشن ملک کے دو سب سے بڑے دھوبیوں، دو سب سے بڑے ڈرائی کلینروں اور چھ سب سے بڑے خطاب یافتہ سرکاری منصفوں پر

مشتمل ہوگا، ہیڈ بٹلر جس کو ہم نے پہلے سر کا خطاب عنایت کیا تھا اور بد میں وزیر الفاظ بنا دیا تھا۔ اس کمیشن کا صدر ہوگا

ہیڈ بٹلر: غلام سے اتنا بڑا کام سرانجام نہیں ہو سکے گا یور میجسٹی

شہنشاہ: مابدولت کو اس کا علم ہے۔۔۔۔۔۔۔۔تمہاری صدارت میں تحقیقاتی کمیشن جونہی اپنی رپورٹ مرتب کرے گا۔ عوام کی کامل تسلی و تشفی کے لیے ما بدولت اس کمیشن پر ایک اور کمیشن بٹھائیں گے تا کہ عدل و انصاف کی نگاہ سے کوئی گوشہ، کوئی کونہ پوشیدہ نہ رہے۔

ہیڈ بٹلر: عالم پناہ عوام کی تشفی پھر بھی نہ ہوگی۔۔۔۔۔۔۔۔انکار ان کی سرشت میں داخل ہے۔

شہنشاہ: (فکرمند ہو کر) عوام کی تشفی بہت ضروری ہے۔۔۔۔۔سب سے مقدم ہے۔۔۔۔۔ہم اس وقت کوئی فیصلہ مرتب کرنے کے لیے تیار نہیں جب تک اس معاملے میں ہماری تشفی نہ ہو کہ عوام ہماری طرف سے بالکل مشتفی ہیں۔۔۔۔۔

ہوالشافی کہہ کر چنانچہ ہم سب سے پہلے، سب سے ضروری کمیشن بٹھاتے ہیں۔

اس کا نام شافی کمیشن ہوگا

ہیڈ بٹلر: عالم پناہ زندہ باد!

ملکہ: عدل و انصاف پائندہ باد!!

فریادی: شافی کمیشن جوئندہ باد!!!

☆☆☆☆☆☆

غالب اور سرکاری ملازمت

حکیم محمود خان مرحوم کے دیوان خانے کے متصل یہ جو مسجد کے عقب میں ایک مکان ہے، مرزا غالب کا ہے۔ اسی کی نسبت آپ نے ایک دفعہ کہا تھا۔

مسجد کی زیر سایہ ایک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایہ خدا ہے

آیئے! ہم یہاں آپ کو دیوان خانے میں لے چلیں۔ کوئی حرج نہیں، رات ہے تو کیا، مرزا صاحب کے یہاں یقیناً اس وقت بھی رونق ہو گی۔۔۔۔۔۔۔ رونق تو خیر اتنی نہیں لیکن منشی شونرائن موجود ہیں۔

(مرزا صاحب سے کاغذ لیتے ہوئے)

منشی شونرائن: تو کیا سچ مچ یہ غزل آپ کی نہیں؟

غالب: (بھنا کر) بھائی حاشا ثم حاشا اگر یہ غزل میری ہو۔ اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں۔ لاحول والا اس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت اس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا قبلہ آپ نے کیا خوب کیا ہے۔

اس اس جفا پہ بتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے اس سے کہا اگر یہ میرا مطلع ہو تو مجھ پر لعنت بات یہ ہے کہ ایک شخص میر مانی اسد ہو گزرے ہیں اور یہ غزل انہی کے شاندار کلام کا نمونہ ہے۔

منشی شونرائن تم طرز تحریر پر بھی غور نہیں کرتے

منشی شونرائن: (کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے) مجھے افسوس ہے (مرزا غالب کا نوکر کلا داخل ہوتا ہے)

کلو: حضور منشی غلام رسول صاحب آئے ہیں

غالب: تشریف لائیں

(کلو کمرے سے باہر جاتا ہے اور منشی غلام رسول داخل ہوتے ہیں)

غلام رسول: تسلیم بجالاتا ہوں مرزا صاحب

غالب: تسلیم، کہئے کیوں کر آنا ہوا منشی صاحب

غلام رسول: مسٹر ٹاسن صاحب سیکرٹری بہادر نے آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے ان کا خیال ہے کہ جناب کو کالج میں فارسی کا استاد مقرر کریں

منشی شونرائن: مبارک ہو مرزا صاحب

غالب: بھئی پوری بات تو سن لو۔۔۔۔ہاں تو اور کیا منشی صاحب؟

غلام رسول: انہوں نے کل دس بجے آپ کو بلایا ہے

غالب: بہتر، میری طرف سے بہت بہت سلام عرض کیجئے گا اور کہئے گا کہ زہے نصیب آپ نے مجھے منتخب فرمایا ہے۔۔۔۔میرا شکریہ قبول ہو۔

غلام رسول: تو میں سیکرٹری صاحب بہادر کی کوٹھی کے بائیں باغ میں حاضر رہوں گا اور جونہی آپ تشریف لائیے گا فوراً آپ کی تشریف آوری کی خبر کر دوں گا۔

غالب: آپ کی نوازش ہے، میں وقت پر حاضر ہو جاؤں گا

غلام رسول: اچھا تو میں اجازت چاہتا ہوں

(منشی غلام رسول کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں)

منشی شونرائن: (مسکراتے ہوئے) اب تو اجازت ہے مبارک باد دینے کی

غالب: (مسکرا کر اٹھتے ہوئے) نہیں سب سے پہلے مجھے اپنی بیگم کی مبارک باد لینے دو۔

مرزا غالب زنان خانے میں خوش خوش داخل ہوتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ امراؤ بیگم بیٹھی وضو کر رہی ہیں انہیں دیکھتے ہی انہوں نے منہ سجالیا اور کہنا شروع کیا۔

امراؤ بیگم: آج دو روز سے کہہ رہی ہوں کہ ایک وقت میرے پاس بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے میری چند باتیں سن لیجئے پر آپ کو فرصت کہاں

غالب: (پاس ہی چوکی پر بیٹھ کر) بیگم صاحبہ! مجھے معلوم ہے کہ آپ مہین مہین چٹکیاں لے کر نصیحتیں یا شخصیتیں کیجئے گا۔ خیر فرمائیے۔

امراؤ بیگم: (چڑ کر) دیکھئے پھر آپ نے طعن طرز کی باتیں شروع کر دیں۔

غالب: (زیر لب مسکراتے ہوئے) اچھا جو آپ کہنا چاہتی ہیں کہئے

امراؤ بیگم: میں کہتی ہوں کہ کب تک گھر کا اساسہ بیچ کر گزران ہوگی۔ کس طرح یہ بیل منڈھے چڑھے گی۔ قرض کس صورت سے ادا ہوگا۔ اے قرض جائے جہنم میں روزمرہ کے مصارف کس طرح پورے ہوں گے اب تو لتے بدن پر جھولنے کا زمانہ آ گیا ہے۔

غالب: (پر اسرار طریقے پر مسکراتے ہوئے) آپ گھبرائیے مت خدا نے سن

لی ہے (چوکی پر سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہیں)

امراؤ بیگم: کیا سن لی ہے خدا نے؟

غالب: (فاتحانہ انداز میں) آپ کے وظیفوں کی برکت سے مسٹر ٹامسن بہادر نے مجھے بلایا ہے کالج میں فارسی زبان کا استاد مقرر کرنا چاہا ہے اور یقینی طور پر میری ہی اک ایسی ذات ہے جو اس عہدے کے لائق ہے۔

امراؤ بیگم: اپنے منہ میاں مٹھو

غالب: جی سن تو لیجئے کم سے کم کم سے کچھ نہیں تو سو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوا تو میرا مقرر ہو ہی جائے گا لئے اب خوش ہوئیں

امراؤ بیگم: (لوٹا لے کر اٹھتے ہوئے) ہو گئی

غالب: تو ذرا ہنس لیجئے

امراؤ بیگم: چو چلے نہ بگھاریئے

غالب: (خوش طبعی سے) نہیں میری جان کی قسم ہنسو تا کہ ذرا مجھے تمہاری طرف سے اطمینان ہو۔

امراؤ بیگم: (کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہے)

غالب: (اطمینان کے ساتھ) خدا میری بیگم کو ہنستا ہی رکھے، بھئی امراؤ بیگم تم غالب کی روح رواں ہو۔

امراؤ بیگم: اب اپنی شاعری رہنے دیجئے اور صاحب سکتر بہادر کے ہاں جانے کی تیاری کیجئے۔

دوسرے روز صبح کو مرزا غالب مسٹر ٹامسن سے ملاقات کرنے کے لیے تیار

ہونے لگے۔

غالب: (مضطرب حالت میں) کیوں میاں مداری یہ کلو داروغہ کہاں گئے؟

مداری: جی ابھی تو یہیں تھے حضور شاید معظم علی عطر فروش کی دکان پر بیٹھے ہوں گے

غالب: ذرا بلانا مجھے سکتر بہادر کے ہاں جانا ہے مرے درباری کپڑے نکال دیں۔

مداری: (قدموں کی چاپ سن کر) لیجئے کلو داروغہ آ گئے۔

(کلو داخل ہوتا ہے)

کلو: آپ نے مجھے یاد فرمایا

غالب: بھئی کلو تم کہاں دن بھر غائب رہتے ہو؟

کلو: کیا حکم ہے سرکار؟

غالب: ذرا میرے درباری کپڑے نکالو، مجھے آج دس بجے سیکرٹری صاحب بہادر کے ہاں جانا ہے۔

کلو: (جا کر پلٹتے ہوئے) کیوں سرکار وہ شالی چوغہ اور دستار ضرور نکالی جائے گی جوڑا کون سا نکالا جائے گا؟

غالب: وہ ٹانڈے کی جامدانی کا انگرکھا یا وہ ریشمی دھاری اور قلمکار اور جوتا ہی سلیم شاہی جو آج آٹھ روز ہوئے میں نے خریدا ہے۔۔۔ہاں ادراک شالی رومال بھی نکال لینا۔

درباری کپڑے پہن کر مرزا غالب تیار ہوئے اور ہوادار میں سیکرٹری صاحب

بہادر کی کوٹھی پر پہنچے۔ منشی غلام رسول پائیں باغ میں پونے دس بجے سے ان کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ جونہی کہاروں نے ہوادار کندھوں سے اتارا، منشی غلام رسول مسٹر ٹامسن بہادر کو خبر دینے کے لیے کوٹھی کے اندر داخل ہوئے۔

غلام رسول: سرکار مرزا غالب سلام عرض کرتے ہیں اور فرماتے ہیں حسب الحکم میں حاضر ہوں۔

ٹامسن: (گھڑی دیکھتے ہوئے) بہت پابندی وقت سے تشریف لائے اچھا سلام دو اور کہو تشریف لائیں۔

منشی غلام رسول باہر آئے غالب چہل قدمی کر رہے تھے۔

غلام رسول: حضور تشریف لے چلئے صاحب بہادر یاد فرماتے ہیں

غالب: (حیرت سے) کیا کہا؟

غلام رسول: آپ کو بلایا ہے حضور

غالب: بلایا ہے؟ دستور کے موافق صاحب سکتر بہادر مجھ ناچیز کو لینے آئیں تو میں چلا چلوں گا۔

غلام رسول: بہتر میں جا کر عرض کرتا ہوں

منشی غلام رسول ایک بار پھر اندر آ گئے اور مسٹر ٹامسن سے کہا

غلام رسول: حضور وہ فرماتے ہیں کہ حسب دستور میرے لینے کو آئیں تو میں چلوں

ٹامسن: (مسکرا کر) بڑے بگڑے دل و دماغ دار معلوم ہوتے ہیں چلو میں خود ان سے بات کرتا ہوں۔

مسٹر ٹامسن کوٹھی سے باہر نکلے اور مرزا غالب سے مصافحہ کیا۔

ٹامسن: تسلیم عرض کرتا ہوں مرزا صاحب

غالب: کورنس بجالاتا ہوں

ٹامسن: آپ اندر تشریف کیوں نہیں لائے۔

غالب: دستور کے موافق آپ مجھ ناچیز کو لینے آتے، میں حاضر ہوتا۔

ٹامسن: (مسکرا کر) مرزا صاحب جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔

غالب: قبلہ گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ کر کے حاضر ہوا ہوں اور یہ امید تھی کہ اس ملازمت سے کچھ عزت زیادہ ہو جائے، نہ اس لیے کہ رہی سہی عزت میں فرق آئے۔

ٹامسن: میں قاعدے سے مجبور ہوں

غالب: (ہوادار کی طرف جاتے ہوئے) تو مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے تسلیم عرض ہے

ٹامسن: تشریف لے جایئے گا۔۔۔۔۔۔۔؟

غالب ہوادار میں بیٹھ جاتے ہیں اور کہاروں کو حکم دیتے ہیں کہ واپس گھر چلو، واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں گھر کے باہر اپاہجوں اور بھکاریوں کا ہجوم جمع ہے اور بی رحمین ان میں خیرات بانٹ رہی ہے۔ مرزا صاحب کو سخت حیرت ہوئی۔ جلدی جلدی اندر داخل ہوئے۔ صحن میں پہنچے تو دیکھا کہ تخت پر امراؤ بیگم دوگانہ ادا

کرنے میں مشغول ہیں۔ انہوں نے سلام پھیرتے ہی مرزا صاحب کو مخاطب کیا۔

امراؤ بیگم: الحمدللہ! کہئے خدا کا فضل ہو گیا

غالب: (غالب تخت پر بیٹھتے ہوئے) جی ہاں، ہو گیا

امراؤ بیگم: کیا مطلب؟

غالب: مطلب یہ کہ رہی سہی عزت مٹی میں ملنے سے بچ گئی

امراؤ بیگم: ہائیں! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ

غالب: (اٹھ کر تمکنت کے ساتھ) بیگم! عزت و ناموش کے لیے ہم مغل بچے مر مٹنے والے ہیں۔ میں وہاں اس خیال سے گیا تھا کہ ملازمت سرکاری سے کچھ اس عزت میں اضافہ ہو جائے گا مگر وہاں صاحب سکتر بہادر میرے استقبال کو باہر نہ آئے۔ بھلا سوچو مجھے یہ بے عزتی کیسے گوارا ہو سکتی ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہو

لیکن میں پوچھتا ہوں یہ باہر خیرات کیسی بٹ رہی ہے۔

امراؤ بیگم: (فکرمند ہو کر) کچھ نہیں

غالب: کچھ نہیں کیا تم تو ابھی کل ہی کہہ رہی تھیں کب تک گھر کا اساسہ بیچ کر گزران ہو گی۔

امراؤ بیگم: (مسکرا دیتی ہے)

غالب: ارے بھئی کچھ تو بتاؤ؟

امراؤ بیگم: کیا بتاؤں ۔۔۔۔؟ کل میں نے اپنا جڑاؤ گلوبند بی رحمین سے گراؤ رکھوا کر کچھ روپے منگوائے تھے۔ شہر میں آپ کی ملازمت کا چرچا سن کر در پر یہ بھکاری جمع ہو گئے تو میں نے بی رحمین سے کہا ''جاؤ ان کا سر صدقہ دے آؤ''

غالب کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں امراؤ بیگم گہری سوچ میں پڑ جاتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی

کشمیرن والے کٹڑے میں ایک چھت پر مرزا اسد اللہ خان (غالب) اور اس سے کچھ دور دوسری چھت پر کنور بلوان سنگھ پتنگ بازی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

اسد اللہ خاں ہوا کا رخ دیکھتا ہے اور اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف سے کہتا ہے ''یوسف ذرا وہ لال جمدھر بڑھانا اس مانگ پاٹی پتنگ کی چلت پھرت اچھی رہے گی۔ مرزا چھیلا کے ہاتھ کے کانپ ٹھڈے چھلے ہوئے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے پتنگ کو ماہرانہ انداز سے دیکھا ''بڑا ہی زوردار پتنگ ہے'' اور بنسی دھر سے مخاطب ہو کے کہا ''وہ دوبلی نخ والی چرخی جو چھوٹی تپائی پر دھری ہے لے لو اور اس پر یہ پتنگ بڑھاؤ۔''

بنسی دھر نے پتنگ لیا اور مرزا یوسف نے چرخی اٹھا کر کہا ''لیکن بھائی جان! اس نخ کا مانجھا تو بہت کھردرا ہے'' اور ڈور پر ہاتھ پھیرنے لگا ''یہ تو ڈھیل پر اڑانے کی نخ ہے۔''

اسد اللہ نے ذرا بھنا کر کہا ''بھئی بلوان سنگھ زیادہ ڈھیل ہی کے پیچ لڑاتے ہیں کھینچ کے پیچ سے وہ بھاگتے ہیں میں نے خود اسی خیال سے مانجھا کھردرا رکھوالیا ہے۔''

مرزا یوسف بڑے بھائی کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

ادھر دوسرے کوٹھے پر کنور بلوان سنگھ سے اس کا دوست شمشیر سنگھ کہہ رہا تھا''

کنے میں باندھ لوں یا آپ باندھ دیجئے گا''

بلوان سنگھ نے آسمان میں اڑتے ہوئے پتنگوں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ تمہیں باندھ لو لیکن دیکھو دوہرے کنے ہوں پھر شمشیر سنگھ کی طرف دیکھ کر تاکیداً کہا ''اور سنا تم نے اوپر سات اور نیچے پانچ گرہیں لگانا۔ ہوا ذرا تیز ہے اور پتنگ بھی زوردار ہے۔''

شمشیر نے ایسا ہی کیا اور پتنگ بڑھا کر کنور بلوان سنگھ سے کہا ''بلوان سنگھ میں تو کھینچ کے پیچ لڑاؤں گا تو سہی۔ اس دوباز سے مرزا نوشہ کی بتی بلوا دوں''

کنور مسکرایا اور اپنی نامعلوم مونچھوں کو تاؤ دے کر اسد اللہ خان کی طرف دیکھا۔ جو اپنا پتنگ بڑھانے میں مشغول تھا اور چلا کر کہا ''کیوں مرزا نوشہ اس مانگ پاٹی پتنگ سے تو مرزا چھیلا کے ہاتھ کی ساخت ٹپک رہی ہے اور سجاوٹ بھی انہی کے ہاتھ کی ہے خوب اڑائے لے رہا ہے۔''

ادھر سے اسد اللہ نے کہا ''تو اور کیا؟''

ادھر سے کنور بلوان سنگھ چلایا ''مگر بھئی سنا مرزا نوشہ میں کھینچ گھسیٹ کے پیچ نہیں لڑاؤں گا۔ تم ٹھہرے سپاہی مار دھاڑ کی سوجھتی ہے میں تو ڈھیل کے پیچ لڑاؤں گا۔ کم از کم پھیٹی دو۔ پھیٹی نخ پر ہو تو وہاں ملانے کا مزا آتا ہے۔''

اسد اللہ نے پتنگ کو خوب ڈور پلائی اور بلوان سنگھ کو جواب دیا ''کنور صاحب آپ دو نہیں، تین پھیٹی پر پتنگ ملائیے۔ آج اس پتنگ سے نو پیچ کاٹوں گا۔ نو شیرو ابنا کے چھوڑوں گا۔''

یہ سن کر ہنسی دھر ذرا آگے بڑھا اور بلند آواز سے کہا ''کنور صاحب سنتے ہیں نو

پیچ تو مرزا نوشہ آپ کے سر چڑھائیں گے اور دھواں گیارھواں میرے آپ کے پیچ لڑے گا۔ میں اس دوبازسے آپ کا پیٹا کاٹوں گا اور ایک کے کنے لوں گا۔''

بلوان سنگھ ہنسا ''لالہ تمہارے تو مچھیا رنڈی کنے لے گی تم مجھ سے کیا پیچ لڑا سکتے ہو اچھا رہی تم سے بھی آخر کے دو پیچ لڑیں گے۔''

شمشیر سنگھ چلایا ''ہنسی دھر تمہارے دوبازکو تو بڑھاتے ہی ہاتھ پر کاٹوں گا تو سہی قلابازی کھاتا ہوا قلعے تک جائے وہاں کے تلنگے تمہارا ڈور لوٹیں اور تمہارا گن گائیں''

اس پر دونوں دوستوں نے خوب قہقہے لگائے ادھر اسداللہ خاں نے جس کی آنکھیں اپنے دوباز پر جمی تھیں ہنسی دھر سے جو پتنگ بڑھا رہا تھا کہا ''ہنسی دھر ہوا کا رخ برا معلوم ہوتا ہے پتنگ ایک ہی لپیٹی پر بنڈول جانے لگا اچھا ملاؤ۔''

تھوڑی دیر کے بعد پیچ مل جاتے ہیں لیکن بلوان سنگھ نے ذرا پتنگ روک کر ایک ایسا آڑا ہاتھ مارا کہ اسداللہ خان کٹ جاتا ہے۔ اس پر بلوان سنگھ اور اس کے ساتھی ایک شور برپا کر دیتے ہیں ''وہ کاٹا، وہ کاٹا مرزا نوشہ کٹ گئے''

اسداللہ خان بگڑ جاتا ہے اور سارا نزلہ یوسف اور ہنسی دھر پر گرتا ہے۔ ہنسی دھر تمہاری جو بات ہے، بے عقلی سے خالی نہیں، گدھے نہیں گدھوں کے سردار ہو تم نے بہت ہی کھردرا مانجھا رکھوایا اور نہ یہ پیچ کٹنے والا تھا پھر مرزا یوسف پر بگڑنا شروع کیا ''یوسف تم نے بھی مجھ پر زور نہ دیا کہ بھائی جان اس نخ پر پتنگ نہ بڑھائے''

مرزا یوسف نے آہستہ سے جواب دیا ''بھائی جان میں نے تو عرض کیا تھا کہ

مانجھا بہت کھردرا ہے اور اس پر ڈھیل ہی کے پیچ لڑیں گے۔ اصل میں بلوان سنگھ نے دھوکا دیا پہلے کہا پیچ پھیٹی دو پھیٹی پر لڑیں گے اور کھینچ کر پیٹا کاٹ لیا۔''

بنسی دھر نے چرخی تپائی پر رکھی اور کہا ''چھوٹے مرزا سچ کہہ رہے ہیں'' مگر اسد اللہ جسے شکست نے جھنجھلا دیا تھا اور بگڑ گیا ''تم دونوں پتنگ بازی سے نا واقف ہی فقط نہیں بلکہ نرے گھرے بیوقوف ہو الو کی دم فاختہ''

بنسی دھر نے غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ''خیر اب جو ہونا تھا ہو گیا آپ نے سینکڑوں پیچ کاٹے ہیں آج بلوان سنگھ نے دھاندلی کر کے ایک پیچ کاٹ لیا تو کیا ہوا۔''

بہت دیر کے بعد مرزا اسد اللہ خان کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور آخر میں یہ طے ہوا کہ چوسر کی ایک بازی رہے چنانچہ تینوں کوٹھوں سے اترے اور گھر کا رخ کیا۔

مرزا اسد اللہ خاں کے نانا خواجہ غلام حسین خان زنان خانے سے باہر نکل رہے تھے کہ چلمن اٹھی اور امراؤ بیگم کی آواز آئی نانا جان آپ سے ایک بات کہنی تو بھول ہی گئی۔

خواجہ غلام حسین نے اپنے قدم روک لئے اور پوچھا ''کیوں امراؤ بیگم خیر تو ہے''

امراؤ بیگم نے دروازے کی آڑ میں شرماتے ہوئے کہا ''نانا جان! آپ خان کو منع بھی نہیں کرتے۔''

''کسے بیٹا؟''

امراؤ بیگم اور زیادہ شرما گئی ''خان ہی کو''

خواجہ صاحب سمجھ گئے ''میں سمجھا مرزا نوشہ کو''

''جی ہاں ! آپ ان کو منع ہی نہیں کرتے ، دن بھر چوسر کھیلتے رہتے ہیں اور۔۔۔اور شام کو روزانہ کنور بلوان سنگھ سے پتنگ بازی ہوتی ہے۔''

خواجہ صاحب نے سرد آہ بھری ''میں جانتا ہوں''

امراؤ بیگم نے دکھ بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا ''پیسہ اڑ رہا ہے اور ان کے مزاج سے تو آپ واقف ہی ہیں میری مجال ہے جو میں اشارے کنائے میں بھی اس بات کو ان پر جتاؤں۔''

خواجہ صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا ''ہاں بیٹی! میں بھی کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ اس کو مناسب طور پر سمجھاؤں سو آج تم نے مجھے یاد دلا دیا۔ میں ضرور کہوں گا تم خاطر جمع رکھو۔''

امراؤ بیگم کو کچھ تسلی ہوئی ''حضور! آپ ہی خیال کریں کہ اس طرح قارون کا خزانہ بھی ہو تو خالی ہو جائے۔ ذرا نہیں سمجھتے کہ آج۔۔۔۔۔'' شرما جاتی ہے ہم دو ہیں کل تین ہو جائیں۔ اپنے فضل و کرم سے کوئی نیا بندہ اللہ بھیج دے تو اس کی پرورش تعلیم سبھی تو ہے۔

خواجہ صاحب مسکرائے ''خدا تیری زبان مبارک کرے''

''جب ہی تو میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ ان کو نصیحت کیجئے اگر سنیں گے تو وہ آپ ہی کی سنیں مجھے تو وہ خاطر ہی میں نہیں لاتے۔''

خواجہ صاحب نے ڈیوڑھی کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا ''اچھا بیٹی! لو میں آج ہی کہتا ہوں۔''

خواجہ صاحب جونہی ڈیوڑی میں پہنچے۔ ان کی اسد اللہ بنسی دھر اور مرزا یوسف سے مڈبھیڑ ہوگئی جو کشمیرن والے کٹڑے سے آرہے تھے۔ خواجہ صاحب نے اسد اللہ کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ''صاحب زادے! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، ذرا ادھر آؤ'' پھر یوسف اور بنسی دھر سے کہا'' آپ دیوان خانے میں چل کر بیٹھئے یہ تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔''

بنسی دھر اور مرزا یوسف چلے جاتے ہیں خواجہ صاحب وہیں ڈیوڑھی میں اسد اللہ خان سے مخاطب ہوتے ہیں۔ مرزا نوشہ میرے اس سوال کا جواب دو مجھے اپنا بہی خواہ سمجھتے ہو یا دشمن بدخواہ؟

اسد اللہ سٹپٹا گیا'' نانا جان! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں آپ نے مجھے پالا ہے، پرورش کیا ہے۔ آپ میرے بہی خواہ کیا معنی ولی نعمت ہیں۔''

خواجہ صاحب اور زیادہ سنجیدہ ہوگئے'' مرزا نوشہ! اب تمہاری عمر ماشاءاللہ سولہ سترہ کے لگ بھگ ہے لیکن تمہارا شغل اب سوائے دن بھر چوسر کھیلنے اور شام کو پتنگ اڑانے کے اور کچھ نہیں رہا۔ دولت برباد کر رہے ہو۔ بھائی! ہوش میں آؤ، کوئی مال حاصل کرو۔ نام ونمود پیدا کرو۔ اپنے بڑوں کی جائیداد میں اضافہ کرو''

خواجہ صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے کہ سامنے سے مرزا اسد اللہ کے استاد مولوی عبدالصمد پارسی ایرانی آتے دکھائی دیئے۔ مرزا اسد اللہ بڑھ کر کورنس بجا لایا'' السلام علیکم''

ملا عبدالصمد صاحب نے شفقت کے ساتھ جواب دیا'' زندہ باش'' خواجہ صاحب سے کہا'' مزاج مبارک''

خواجہ صاحب بھی مسکرائے ''الحمدللہ! ہر حال میں اللہ کا شکر ہے آپ خوب وقت پر آئے۔ میں آپ کے شاگرد کو کچھ نصیحت کر رہا تھا۔''

ملا صاحب ایک بار پھر اسد اللہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے خواجہ صاحب نے کہنا شروع کیا ''میں اس سے کہہ رہا تھا کہ بھئی اب تم سولہ سترہ برس کے ہو گئے ہو ایک بچے کے باپ ہونے والے ہو، ذرا لہو و لعب کھیل کود سے ہاتھ اٹھاؤ۔ کچھ دنیا میں نام پیدا کرو کوئی کمال حاصل کرو''

ملا عبدالصمد صاحب نے جنہیں غالباً اسد اللہ خان نے کوئی اشارہ کیا تھا اس سے کہا ''جاؤ بابا جاؤ میں خواجہ صاحب سے باتیں کر کے ابھی تمہارے پاس آتا ہوں''

اسد اللہ خان نے موقع غنیمت سمجھا اور وہاں سے کھسک گیا۔ اس کے بعد ملا صاحب خواجہ غلام حسین خاں سے مخاطب ہوئے ''جناب خواجہ صاحب! برا نہ مانئے تو ایک بات عرض کروں''

خواجہ صاحب نے فوراً ہی کہا ''نہیں برا ماننے کی کیا بات ہے آپ فرمائیے کیا ارشاد ہے؟''

ملا صاحب کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پیدا ہوئی ''مرزا نوشہ! آپ کی طرح کمیدان یا باپ دادا کی طرح رسالدار یا خان سے بھی زیادہ عہدہ ہفت ہزاری پر پہنچ کر سپہ سالار بھی ہو گیا تو کیا ایسوں کے نام ان کے ساتھ ہی مٹ جاتے ہیں مگر اسے تو ادب اور شعر کا افراسیاب بننا ہے۔''

خواجہ غلام حسین کچھ چکرا سے گئے۔ ''آپ کی اس تقریر سے میں کچھ نہ سمجھا،

آپ کا مطلب کیا ہے؟''

ملا صاحب نے اپنا مطلب واضح کیا ''اسد اللہ خان بہت بڑا شاعر ہوگا اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آپ کا اور ہمارا نام اسی کی بدولت روشن ہوگا سو اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیجئے''

خواجہ صاحب نے ملا عبدالصمد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ''ملا صاحب! میں تو حباب بر آب ہوں اور آپ اپنے وطن ایران جا رہے ہیں باقی اگر آپ کا یہی خیال ہے کہ مرزا نوشہ فن شاعری میں نام پیدا کرے گا اور اس کا کلام قیامت تک باقی رہے گا تو یونہی سہی خدا ایسا ہی کرے آپ کے منہ میں گھی اور شکر''

دونوں باتیں کرتے ہوئے دیوان خانے میں چلے گئے۔ ادھر بنسی دھر کے مکان میں چوسر بچھی ہوئی ہے اور اسد اللہ خان بری طرح اس کھیل میں محو ہے، بنسی دھر نے پانسہ پھینکا اور اسد اللہ خان سے کہا ''رنگ تو آپ سب لے گئے۔ بد رنگ میں یہ جو دو گوٹیں آپ کی باقی ہیں ان کے لیے ساری اپنی گوٹیں لے کر کھڑا ہو جاؤں گا اور آپ کو منزل مقصود تک پہنچنے دوں گا۔''

اسد اللہ خان مسکرایا؟ ''یہ گوٹ تو پاؤ بارہ یا سات چھ تیرہ سے اس گھر میں پہنچتی ہے۔ رہی دوسری تو وہ کچے بارہ سے گھر میں جاتی ہے لو دیکھو پھینکتا ہوں''

ہنسی دھر نے متنبہ کیا ''پانسہ نہ بنا کر پھینکنے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ اوپر تلے پانسے رکھ رہے ہیں۔''

اسد اللہ خان نے ہاتھ روک لیا اور بنسی دھر سے کہا ''اب روتے ہو'' پھر پانسہ پھینکا ''یہ پاؤ بارہ وہ مارا پاؤ بارہ لو کچے بارہ بھی لو لو یہ کچے بارہ دیکھ لو کچے بارہ

دھرے پڑے ہیں۔ یوں یہ پانسہ پھینکتے ہیں۔''

مرزا یوسف نے جو بغل میں بیٹھا تھا کہا ''بھائی جان! آپ کی پشت پر جوگنی ہے جوگنی''

اسد اللہ خان نے ذرا دون کی لی ''کہو، بنسی دھر چھ تین نو پھینکوں؟''

بنسی دھر مسکرایا ''چھ تین نو کہیں آئے نہ ہوں''

اسد اللہ خان نے بڑی پھرتی سے پانسہ پھینکا پر چھن تین نو نہ آئے۔ اسی پانسے پر بازی رکی پڑی تھی کہ اتنے میں خواجہ غلام حسین صاحب کا ملازم گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اطلاع دی ''حضور! آپ کے نانا جان کی بری حالت ہے، دل پکڑے کراہ رہے ہیں۔''

اسد اللہ سخت متحیر ہوا ''ارے بھئی ابھی ابھی تو میں ان کو ملا صاحب کے ساتھ اچھا بھلا چھوڑ کے آیا ہوں۔۔۔۔'' بازی کا خیال آیا تو زچ بچ ہو کر کہا ''اور یہاں بازی چھ تین نو پر رکی ہوئی ہے۔''

اسد اللہ خان اٹھنے لگا تو بنسی دھر نے کہا ''مرزا نوشہ! اب دو ہاتھ میں میری ساری گوٹیں پونگ جاتی ہیں یا چھ تین نو پھینکتے جائیے یا ہار مان لیجئے''

اسد اللہ خان نے جواب دیا ''بھئی نانا جان کو دیکھ آؤں تم یونہی بازی بچھی رہنے دو'' اور ملازم کے ساتھ چلا گیا۔ گھر پہنچا تو ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ خواجہ غلام حسین بعارضہ دل انتقال کر چکے تھے۔

اپنے نانا جان کے انتقال کے بعد اسد اللہ خان کی لاابالی طبیعت اور زیادہ رنگ لائی۔ امراؤ بیگم کی شکایتیں بڑھتی گئیں۔ آخر نواب احمد بخش اپنے چھوٹے

بھائی نواب الٰہی بخش خان معروف کے یہاں گئے اور کہا ''نواب احمد بخش مرزا نوشہ نے اپنے نانا کے مرتے ہی خوب گلچھرے اڑانے شروع کیے ہیں میرے خیال میں اگر ان کا یہی عالم رہا تو جائیداد وغیرہ سب کنارے لگ جائے گی۔ بھتیجی اور بیٹی میں کیا فرق ہے جیسیا مراؤ بیگم تمہاری بیٹی ویسی میری''

نواب الٰہی بخش نے باادب پوچھا ''تو پھر بھائی جان کیا کیا جائے؟''

نواب احمد بخش نے رائے دی ''یہ کیا جائے کہ تم مرزا نوشہ کو اپنے پاس بلالو اور اپنی نگرانی میں رکھو'' اور پھر تاکیداً کہا ''دیر نہ کرو جلدی جاؤ اور اس کو لے آؤ کہ اسی میں خیریت ہے۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ جو اس کو اور مرزا یوسف کو ملتا ہے، وہ بھی چٹ کر جاتا ہے اور میں سنتا ہوں۔ ماں سے الگ لیتا ہے اور نانا کی جائیداد ملاک پر بھی ہاتھ صاف کر رہا ہے یا کر چکا ہے۔ تم اس سے کہہ دینا کہ بھائی جان نواب احمد بخش صاحب کی بھی یہی رائے ہے کہ تم دلی چلے آؤ۔''

دونوں بھائیوں کے فیصلے کے مطابق مرزا اسداللہ خان کو آخر آگرہ چھوڑ کر دلی جانا پڑ گیا۔ جہاں اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کی نگرانی میں اس کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔

☆☆☆☆☆

غالب اور چودھویں

مرزا غالب اپنے دوست حاتم علی مہر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ''مغل بچے بھی عجیب ہوتے ہیں کہ جس سے عشق کرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں میں نے بھی اپنی جوانی میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی سے عشق کیا اور اسے مار رکھا ہے۔''

1264ء میں مرزا غالب چوسر کی بدولت قید ہوئے۔ اس واقعے کے متعلق ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں ''کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں باوجود یکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔''

افسانہ نگار کے لیے یہ چند اشارے مرزا غالب کی رومانی زندگی کا نقشہ تیار کرنے میں کافی مدد دے سکتے ہیں رومان کی ازتکون تو ''ستم پیشہ ڈومنی'' اور کوتوال دشمن تھا کے مختصر الفاظ مکمل کر دیتے ہیں۔

ستم پیشہ ڈومنی سے مرزا غالب کی ملاقات کیسے ہوئی آیئے ہم تخیل کی مدد سے اس کی تصویر بناتے ہیں۔

صبح کا وقت ہے مرغ اذانیں دے رہے ہیں۔ مرزا نوشہ ہوادار میں بیٹھا ہے جسے چار کہار لئے جا رہے ہیں۔ مرزا نوشہ کی نشست سے پتہ چلتا ہے کہ سخت افسردہ ہے۔ افسردگی کا باعث یہ ہے کہ اس نے مشاعرے میں اپنی بہترین غزل سنائی مگر حاضرین نے داد نہ دی۔ ایک فقط نواب شفیتہ نے اس کے کلام کو سراہا۔ صدرالدین آزردہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی لیکن بھرے ہوئے مشاعرے میں

دو آدمیوں کی داد سے کیا ہوتا ہے۔ مرزا نوشتہ کی طبیعت اور بھی زیادہ مکدر ہوئی تھی۔ جب لوگوں نے ذوق کے کلام کو صرف اس لیے پسند کیا کیوں کہ وہ استاد شاہ تھا۔

مشاعرہ جاری تھا مگر مرزا نوشتہ اٹھ کر چلا آیا وہ اور زیادہ کوفت نہیں اٹھا سکتا تھا۔

مشاعرے سے باہر نکل کر وہ ہوادار میں بیٹھا کہاروں نے پوچھا ''حضور، کیا گھر چلیں گے؟'' مرزا نوشتہ نے کہا نہیں، ہم ابھی کچھ دیر سیر کریں گے، ایسے بازاروں سے لے چلو جو سنسان پڑے ہوں۔

کہار بہت دیر تک مرزا نوشہ کو اٹھائے پھرتے رہے، جس بازار سے بھی گزرے، وہ سنسان تھا۔ چودھویں کا چاند غروب ہونے کے لیے نیچے جھک گیا تھا۔ اس کی روشنی اداس ہوگئی تھی۔

ایک بہت ہی سنسان بازار میں ہوادار گزر رہا تھا کہ دور سے سارنگی کی آواز آئی بھیرویں کے سر تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی عورت کے گانے کی تھکی ہوئی آواز آئی مرزا نوشہ چونک پڑا اسی کی غزل کا ایک مطلع بھیرویں کے سروں پر تیر رہا تھا۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

آواز میں درد تھا، جوانی تھی لیکن یہ مطلع ختم ہوتے ہی آواز ڈوب گئی۔

دور ایک کوٹھے پر ملکہ جان جمائیاں لے رہی ہے۔ چاندنی بچھی ہوئی ہے۔

اس کی سلوٹوں سے اور موتیے اور گلاب کی بکھری اور مسلی ہوئی پتیوں سے پتہ چلتا ہے کہ محض رقص و سرود کو ٹھنڈے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔

ملکہ جان نے ایک لمبی جمائی لی اور اپنا ضعیف بدن جھٹک کر اپنی سانولی سلونی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی نوچی سے جو گاؤ تکیے پر سر رکھے اپنی مخروطی انگلیاں چٹخا رہی تھی کہا ''مون ہے، شیفتہ ہے، آزردہ ہے استاد شاہ ذوق ہے۔۔۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کل کے اس مبتدی شاعر غالب کے کلام میں کیا دھرا ہے کہ جب نہ تب تو اسی کی غزل گائے گی!''

نوچی مسکرائی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی ایک سرد آہ بھر کر اس نے کہا

''دیکھنا'' تقریر کی لذت کو جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ ملکہ جان نے پہلے سے بھی زیادہ لمبی جمائی لی اور کہا ''بھئی اب سو بھی چکو بہت راہ دیکھی جمعدار حشمت خان کی۔''

شوخ چشم نوچی نے انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر بازو اوپر سے لے جا کر ایک جمائی لیتے ہوئے کہا

''بس اب آتے ہی ہوں گے میں تو ان سے کہا تھا کہ مرزا غالب کے آگے سے جونہی شمع ہٹے وہ ان کی غزل کی نقل لے کر چلے آئیں''

ملکہ جان نے برا سا منہ بنایا ''اس نگوڑے مرزا غالب کے لیے اب تو اپنی نیندیں بھی حرام کرے گی تو''

نوچی مسکرائی سامنے فدن میاں سارنگی پر ٹھوڑی ٹکائے پینک میں اونگھ رہا تھا۔

نوچی نے طنبورہ اٹھایا اور اس کے تار ہولے ہولے چھیڑنا شروع کیے پھر اس کے حلق سے خود بخود اشعار راگ بن کر نکلنے لگے۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

فدن میاں ایک دم چونکا آنکھیں مندی رہیں لیکن سارنگی کے تاروں پر اس کا گز چلنے لگا

میں بلاتا تو ہوں ان کو مگر اے جذبہ دل
ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

گانے والی کی تسکین نہ ہوئی چنانچہ اس نے شعر کو یوں گانا شروع کیا

میں بلاتی تو ہوں ان کو مگر اے جذبہ دل
ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

ملکہ جان ایک دم چونکہ اس نے نوچی کو اشارہ کیا وہ بھی چونک پڑی سامنے دہلیز پر مرزا نوشہ ایستادہ تھا۔ ملکہ جان فوراً اٹھی اور تسلیمات بجا لائی نوچی نے بھی اٹھ کر کھڑے قد تعظیم دی، یہ جان کر کہ شہر کے کوئی رئیس ہیں۔ ملکہ استقبال کے لیے آگے بڑھی ''آیئے آیئے! تشریف لائی زہے قسمت کہ آپ ایسے رئیس مجھ غریب کو سرفراز فرمائیں آپ کے آنے سے میرا گھر روشن ہو گیا۔''

مرزا نوشہ نے حسن ملیح کے نادر نمونے کی طرف دیکھا نوچی نے جھک کر کہا'' آیئے ادھر مسند پر تشریف رکھیے''

مرزا نوشہ ذرا تامل کے بعد بیٹھ گیا اور کہنے لگا'' تمہارا گلا بہت سریلا ہے اور

تمہاری آواز میں درد ہے نہ جانے کیوں بے کھٹکے اندر چلا آیا۔ کیا تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

نوچی نے پاس ہی بیٹھتے ہوئے کہا ''جی مجھے چودھویں کہتے ہیں''

مرزا نوشہ مسکرایا ''یعنی آج کی رات''

چودھویں مسکرادی مرزا نوشہ نے کہا ''بھئی خوب گاتی ہو''

چودھویں نے حسب دستور جواب دیا ''آپ مجھے بنا رہے ہیں''

مرزا نوشہ کو جگت سوجھی ''بنائی تر کاری سبزی جاتی ہے تم کو تھوڑے ہی بنایا جا سکتا ہے''

چودھویں کو کچھ جواب دینا ہی تھا چنانچہ اس نے کہا ''خوب خوب، یہ بھی خوب، میں بنی بنائی ہوں اللہ نے مجھے بنایا''

مرزا نے مزید جگت کی ''اللہ نے سبھی کو بنایا ہے پر تم بنی ابھی نہیں ہو''

چودھویں کے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس کے چمکیلے دانت موتیوں کی طرح چمکے۔ مرزا نوشہ نے فرمائش کی ''ضلع جگت کو چھوڑو اور ذرا اور ذرا پھر وہی غزل گاؤ، نہ معلوم کس کی غزل ہے'' نکتہ چیں ہے غم دل۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہاں ذرا شروع کرو۔

چودھویں کو فرمائش کا یہ انداز کچھ پسند نہ آیا چنانچہ اس نے ذرا تنک کر کہا ''یہ غزل غالب کی ہے اور غالب کا سمجھنا کوئی سہل نہیں''

مرزا نوشہ نے پوچھا ''کیوں؟''

''سمجھے تو کوئی پختہ کار سمجھے آپ ایسے نوجوان کیا سمجھیں گے؟''

مرزا نوشہ مسکرایا ''بھاؤ بتا کے گاؤ تو کچھ بھاؤ کے انگوں سے شاید سمجھ لوں''

اب چودھویں کو جگت سوجھی، چھلکی سی ناک چڑھا کر کہا ''بھاؤ کا بھاؤ مہنگا پڑے گا''

مرزا نوشہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا پھر چودھویں سے مخاطب ہوا

''آپ کو غالب کا کلام بہت پسند ہے؟''

ملکہ جان جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی۔ مرزا نوشہ سے مخاطب ہوئی ''حضور! کئی بار کہہ چکی ہوں اس سے کہ ذوق ہے، مومن ہے، نصیر ہے، شیفتہ ہے، سب مانے ہوئے استاد ہیں پر اسے نہ جانے اس عطائی غالب کے کلام میں کیا خاص بات نظر آتی ہے کہ آپ مومن کی فرمائش کریں گے اور یہ غالب شروع کر دے گی۔''

مرزا نوشہ نے مسکرا کر چودھویں کی طرف دیکھا اور کہا ''ایسی کوئی خاص بات ہو گی؟''

چودھویں سنجیدہ ہو گئی ''یہ تو وہی سمجھے جس کو لگی ہو''

مرزا نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا ''کیا میں سن سکتا ہوں وہ آپ کے دل کی لگی کیا ہے؟''

چودھویں نے سرد آہ بھری ''نہ پوچھئے کہاں میں غریب ڈومنی کہاں غالب۔۔۔۔۔۔ جانے دیجئے اس بات کو۔۔۔۔۔ کہئے آپ کس کی غزل سنیں گے؟''

مرزا نوشہ مسکرایا ''غالب کی اور کہئے تو میں آپ کو غالب کے پاس لے

چلوں۔ چودھویں کے چاند کا برج اسد میں طلوع ہو جائے''

چودھویں اس کا مطلب نہ سمجھی ''مجھ ایسی کو وہ کیا پوچھیں گے خاک ہو جائیں گے ہم ان کو خبر ہونے تک۔''

مشاعرے میں مرزا نوشہ کو جو کوفت ہوئی تھی۔ اب وہ بالکل دور ہو چکی تھی ان کے سامنے سانولے سانولے رنگ کی موٹی موٹی آنکھوں والی لڑکی بیٹھی تھی جس کو اس کے کلام سے والہانہ محبت تھی یہ کیوں اور کیسے پیدا ہوئی؟ مرزا نوشہ بہت دیر تک گفتگو کرنے کے باوجود بھی نہ جان سکا۔ آخر میں مرزا نوشہ نے اس سے پوچھا ''کیا تم نے کبھی غالب کو دیکھا ہے؟''

چودھویں نے مختصر سا جواب دیا ''نہیں''

مرزا نوشہ نے کہا ''میں انہیں جانتا ہوں بہت ہی بگڑے رئیس ہیں تم چاہو تو میں انہیں لا سکتا ہوں یہاں''

چودھویں کا چہرہ تمتما اٹھا ''سچ؟''

مرزا نے کہا ''میں کوشش کروں گا'' اور یہ کہہ کر جیب سے ایک کاغذ نکالا ''میرا کلام سنو گی؟''

چودھویں نے رسمی طور پر کہا ''سنائیے ارشاد''

مرزا نوشہ نے مسکرا کر کاغذ کھولا ''یوں تو میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں پر تمہیں تو غالب کے کلام سے محبت ہے میرا کلام تمہیں کیا پسند آئے گا؟''

چودھویں نے پھر رسمی طور پر کہا ''جی نہیں، کیوں پسند نہ آئے گا آپ ارشاد فرمائیے''

مرزا نوشہ نے ابھی اس غزل کے دو ہی شعر سنائے ہوں گے جو اس نے مشاعرے میں پڑھی تھی کہ چودھویں نے ٹوک کر پوچھا ''آپ اس مشاعرے میں شریک تھے جو مفتی صدرالدین آرزودہ کے یہاں ہو رہا تھا''

مرزا نوشہ نے جواب دیا ''جی ہاں''

چودھویں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا ''غالب تھے؟''

مرزا نوشہ نے جواب دیا ''جی ہاں!''

چودھویں نے اور زیادہ اشتیاق سے کہا ''کوئی ان کی غزل کا شعر یاد ہو تو سنائیے؟''

مرزا نوشہ نے افسوس ظاہر کیا اور کہا ''اس وقت کوئی یاد نہیں آ رہا''

اس نے اب مذاق کو اور زیادہ طول نہ دینا چاہا۔ ایک گلوری چودھویں کے ہاتھ کی بنی ہوئی لی۔ خاص دان میں ایک اشرفی رکھ اور رخصت چاہی۔

کوٹھے سے نیچے اترا تو سیڑھیوں کے پاس مرزا نوشہ کی مڈبھیڑ جمعدار حشمت خان سے ہوئی جو مشاعرے سے واپس آ رہا تھا۔ حشمت خاں اس کو دیکھ کو بھونچکا رہ گیا ''مرزا نوشہ آپ یہاں کہاں؟''

مرزا نوشہ خاموش رہا حشمت خاں نے معنی خیز انداز میں کہا ''تو یہ کہیے کہ آپ کا بھی اس وادی میں کبھی کبھی گزر ہوتا ہے؟''

مرزا نوشہ نے مختصر سا جواب دیا ''فقط آج اور وہ بھی اتفاق سے خدا حافظ''

یہ کہہ کر وہ ہوادار میں بیٹھ گیا۔ حشمت خان اوپر گیا تو چودھویں دیوانہ وار اس کی طرف بڑھی ''کہیے غالب کی غزل لائے؟''

حشمت خان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے غزل کا کاغذ جیب سے نکالا اور بڑ بڑایا ''لایا ہوں ۔۔۔۔۔۔لو'' چودھویں نے پر اشتیاق ہاتھوں سے کاغذ لیا تو حشمت خاں نے ذرا لہجے کو درشت کرتے ہوئے کہا ''پر غالب تو ابھی تمہارے کوٹھے سے اتر کر گئے ۔۔۔۔۔یہ ماجرا کیا ہے؟''

چودھویں چکرا سی گئی'' غالب ۔۔۔۔۔۔۔۔کوٹھے پر ۔۔۔۔۔۔ابھی ابھی اتر کر گئے ۔۔۔۔۔۔مجھے دیوانہ بنا رہے ہو۔۔۔۔۔میرا کوٹھا کہاں، غالب کہاں؟''

جمعدار نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا'' واقعی سچ کہتا ہوں وہ غالب تھے جو ابھی ابھی تمہارے کوٹھے سے اترے۔''

چودھویں اور زیادہ چکرا گئی ''جھوٹ؟''

''نہیں چودھویں سچ کہہ رہا ہوں''

چودھویں نے پاگلوں کی طرح حشمت خان کو دیکھنا شروع کیا میری جان کی قسم غالب تھے؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔جھوٹ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔مجھ کو بنا رہے ہو۔اللہ سچ کہو، غالب تھے؟

حشمت خاں بھنا گیا'' ارے تمہاری ہی جان کی قسم غالب تھے۔مرزا اسداللہ خان غالب المعروف مرزا نوشہ جو اسد بھی تخلص کرتے ہیں''

چودھویں بھاگی ہوئی کھڑکی کی طرف گئی ''ہائے میں مرگئی، غالب تھے'' نیچے جھانک کر دیکھا مگر بازار خالی تھا'' میرا ستیاناس ہو میں نے خان کی خاطر مدارت بھی نہ کی''

یہ کہہ کر اس نے غزل کا کاغذ کھول کر دیکھا اور سر پیٹ لیا ''اللہ یہ خواب ہے یا بیداری سچ ہے تو وہ غالب ہی تھے۔سو میں غالب، ہزار میں غالب تھے۔جمعدار صاحب! سچ کہا آپ نے ضرور غالب تھے۔ہائے میں نے ان سے کہا آپ غالب کے کلام کو کیا سمجھیں میں مر جاؤں۔۔۔۔۔بھلا وہ کیا دل میں کہتے ہوں گے۔۔۔۔۔ہائے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔اف نہ معلوم میں کیا کیا ان سے کہہ گئی''

یہ کہتے کہتے اس نے غزل کا کاغذ منہ پر پھیلایا اور رونے لگی۔

ختم شد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔The End